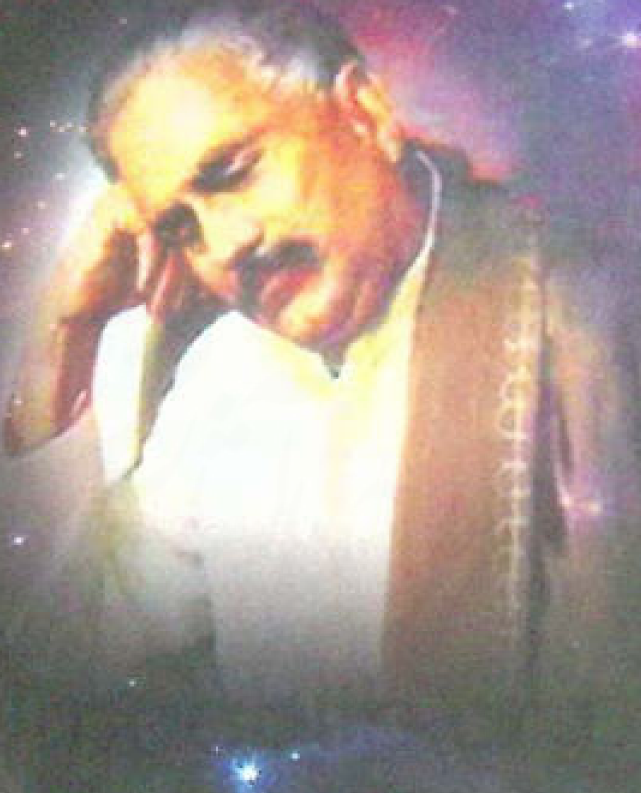
آئینہ خانہ اقبال

مرزا محمد اسلم

گولڈ میڈلسٹ تحریک پاکستان



آئینہ خانۂ اقبال

مرزا محمد اسلم

(گولڈ میڈلسٹ تحریک پاکستان)

مکتبہ جمال

تیسری منزل • حسن مارکیٹ • اردو بازار • لاہور

Cell: +92-322-4786128 Ph: 042-37232731

Email: mjamal09@gmail.com, www.maktabajamal.com

نام کتاب	:	آئینہ خانہ اقبال
مصنف	:	مرزا محمد اسلم (گولڈ میڈلسٹ تحریک پاکستان)
اہتمام	:	میاں وقار احمد کھٹانہ
ناشر	:	مکتبہ جمال • لاہور
مطبع	:	تایا سنز پرنٹرز • لاہور
اشاعت	:	2015ء
قیمت	:	250 روپے

مکتبہ جمال
تیسری منزل حسن مارکیٹ • اردو بازار • لاہور
Cell: +92-322-4786128 Ph: 042-37232731
Email: mjamal09@gmail.com, www.maktabajamal.com

انتساب

بصد خلوص و عقیدت محترم ڈاکٹر نذیر قیصر کے نام جن کی زندگی کے سب کارناموں میں علامہ اقبال کی عظمت فروزاں ہے۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل پاک باز!

فہرست

پیش لفظ

مرزا محمد اسلم اقبال کے شیدائی ہیں۔ وہ اقبال فورم انٹرنیشنل کے روحِ رواں ہیں اور عرصۂ دراز سے اس فورم سے منسلک ہیں۔ اُنھوں نے اس فورم میں بہت سے مقالات بھی پیش کیے ہیں۔ وہ ہر نشست میں بھرپور شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ اُنھیں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر کمال حاصل ہے اور وہ یادداشت بھی خوب رکھتے ہیں۔ ہم اُن کی زبانی علامہ اقبال کا فارسی اور اُردو کلام بہت ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔

مرزا محمد اسلم صاحب نے اس کتاب کا عنوان ''آئینہ خانۂ اقبال'' رکھا ہے جو کہ نہایت موزوں ہے۔ مصنف نے ''آئینہ'' کا لفظ استعمال کر کے تصوف کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس کتاب کو مصنف کا روحانی سفر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ علامہ محمد اقبال کے فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ کتاب کا آغاز ان کے مضمون ''علامہ اقبال اور اہم معاشرتی مسائل'' سے ہوتا ہے جس میں انسان کے سماجی شعور کی اساس روحانیت پر رکھی گئی ہے۔ جدید دور کا انسان روحانیت سے اپنا رشتہ جوڑنے کی بجائے توڑتا چلا جا رہا ہے۔ اقبال کی مابعد الطبیعیات اس روحانی رشتے کی نشاندہی کرتی ہے اور دورِ حاضر کے انسان کو اپنے اصل اور مرکز سے جڑنے کی دعوت دیتی ہے۔ ساری کتاب اسی تناظر میں لکھی گئی ہے۔

مصنف بہت سے موضوعات زیرِ بحث لائے ہیں جو کہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اُنھوں نے ''اقبال کا نظریۂ توحید و رسالت۔ ایمان و یقین اور زندگی'' میں اصولی باتیں کی ہیں جن سے ہماری قوم میں پھر سے ایک نئی اُمنگ پیدا ہو سکتی ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کی فکر کو مولانا روم، حضرت میاں میر، حسین بن منصور حلاج، مجدد الف ثانی اور محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ منصور حلاج اور ابن عربی کی بابت مصنف کی کوشش بہت جراُت مندانہ ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مختلف ممالک میں

منصور حلاج اور ابن عربی پر تحقیقی کام جاری ہے۔ اور اُن کی مابعد الطبیعیات پر بہت سی مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس جدید تحقیق کے حوالے سے وحدت الوجود کے نظریے کی بابت اب وہ خدشات اور خطرات نہیں رہے جو عرصۂ دراز سے مفکرین کے ذہنوں میں تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ضمن میں حضرت خواجہ غلام فرید کی مابعد الطبیعیات کو بھی سامنے رکھا جائے تاکہ فکرِ اقبال کے اس زاویے کو سمجھنے میں قدرے آسانی ہو۔

مصنف نے اقبال کی سیاسی فکر کو اُجاگر کیا ہے اور اقبال کو صحیح معنوں میں تحریک پاکستان کا "خضرِ راہ" قرار دیا ہے۔ اُن کا مضمون "علامہ اقبال اور قائد اعظم کا آئینۂ استقبال۔ پاکستان" نہایت دردمندی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ پاکستان کا تصور اس خطۂ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنا ہے۔ جو انفرادی و اجتماعی زندگی میں ترقی، امن اور سکون کی ضامن ہے۔ اس سے پاکستان صحیح معنوں میں ایک فلاحی مملکت بن سکتا ہے۔

آخر میں مصنف نے انگریزی میں اپنا مضمون Ijtehad with Reference to Iqbal and Pakistan شامل کیا ہے۔ یہ اہم مضمون اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اقبال کا تصورِ اجتہاد پاکستانی قوم کے مسائل کا حل ہے۔ پاکستانی قوم کی فلاح اس بات میں مضمر ہے کہ وہ احسن طریقے سے قرآن کے ابدی اصولوں اور جدید تقاضوں کو ہم آہنگ کرے۔

مصنف اس خوبصورت کتاب لکھنے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر
(ستارۂ امتیاز)
وفاقی سیکرٹری (ر)،
لاہور

مورخہ ۲۴ اگست ۲۰۱۵ء

عرضِ مصنف

حضرت علامہ اقبال کا ذکر اُن کے عظیم پیش رو شاعر غالب سے کرتا ہوں۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبستاں کا

علامہ اقبال کی درخشاں و تابندہ ہستی کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ جیسے صبح کے وقت خورشید عالم کی کرنوں کی روشنی سے تمام سبزہ زار پر شبنم کے کروڑوں قطرے آئینہ خانوں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ جن کی روشنی سے عالم بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ اقبال کا اپنا شعر ہے:

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

یہاں جوہر آئینہ کو بچا کر بے مصرف رکھ چھوڑنا زندگی کا مقصد نہیں بلکہ آئینے کے جوہر کو خدمتِ انسانیت کے لیے اس طرح کام میں لایا جائے کہ بے شک ٹوٹ کر چکنا چور ہو جائے لیکن اپنی زندگی کو اعلیٰ مقصد حیات کے لیے قربان کر دے۔ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب تر عمل ہے۔

یہی اقبال کا پیغام ہے۔ اگرچہ اُسے جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کیے پون صدی سے زیادہ مدت ہو چکی ہے مگر اب بھی اُس کے مداح اور قدردان آئے دن اپنے رشحات قلم نظم و نثر و مضامین کے ذریعے نہایت عقیدت و محبت سے تصنیفات کی صورت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اور اقبال سے عقیدت و علمی لگاؤ کا یہ شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ اقبال اپنی ان خدمات کی وجہ سے جو انھوں نے اہلِ اسلام اور عالمِ انسانیت کے لیے علمی، ادبی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، دینی، اخلاقی، سیاسی، فکر و عمل کی ترویج، زندگی کو ہر لحظہ بہتر کرنے کے لیے جدوجہد، جستجو، اجتہاد، باہمی محبت ایک دوسرے کی آزادی کے

حق کی حفاظت، فقر و استغنا، خوش اخلاقی، رواداری، مقامی اور بین الاقوامی سطح پر کی ہیں۔ اُن کی ذات والاصفات کو سب کے لیے روشنی و ہدایت وعمل کا مینارۂ نور بنا دیا ہے۔ ہم اس نعمتِ خداوندی کا جتنا شکر کریں کم ہے کہ اُس نے ہم میں اقبال کو پیدا کیا جس نے ہمیں خوابِ غفلت سے جگا کر آزاد وطن حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کی۔ ناممکن، ممکن ہو گیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ یہ اُس کی پیغمبرانہ بصیرت، استقامت اور اسلام کی حقانیت پر مکمل صدق و یقین کا نتیجہ تھا۔ اقبال کے نہایت عزیز دوست فارسی کے اعلیٰ پائے کے شاعر مولانا غلام قادر گرامی نے یوں ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

مولانا گرامی خط و کتابت میں اقبال کو ہمیشہ مجدد عصر کہہ کر پکارتے۔ اقبال خود بھی کہتے ہیں:

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

اقبال کے آئینہ کلام کا عکس مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے۔ احساسِ ذات، مقصدِ حیات سے آگہی، تعمیرِ ذات و تکمیلِ خودی اور اس مقصد کے لیے تعمیری فکر و عمل، ذوق و شوق، سچی لگن، جدوجہد مسلسل، جسے وہ عشق کا نام دیتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جسے خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنا نائب بنا کر احسن التقین کہا ہے۔ گویا انسان ودیعت کردہ تخلیقی جوہر سے آراستہ کر کے بھیجا گیا ہے۔ تاکہ دُنیا میں آ کر اس دُنیا کو جنت کا نمونہ بنا دے۔ اور کھوئی ہوئی جنت کو بھول جائے۔ وضاحت کے لیے اقبال کے چند اشعار پیش ہیں۔ جو محرکِ تعمیر و عمل ہیں:

وہی ہے تیرا جہاں جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

پُرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

اقبال اپنی وجدانی صلاحیت و پیغام کی صداقت پر یقین رکھتا ہے۔ اور نہایت دردمندی اور صدقِ یقین کے ساتھ درماندہ کاروانِ مسلم کی رہبری کا بیڑہ اُٹھاتا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
تیرے لیے ہے میرا شعلۂ نوا قندیل

صفتِ برق چمکتا ہے میرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مقامِ گفتگو کیا ہے؟ اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے، اور میری کیمیا کیا ہے؟

یہ روئداد تو چند جملوں میں اقبال کے تصنیفاتی تحریروں کی تھی۔ ایک اور پہلو کا ذکر کرنا مناسب لگتا ہے کہ اقبال نہایت سادہ مزاج، سادہ لباس، سادہ خوراک و تکلفات، علمیت و شہرت کے پندار و تمکنت سے پاک ہر سطح کے غریب و امیر عالم و ان پڑھ سب سے یکساں خلوص و توجہ سے ملتے۔ اور ہر شخص کو گھریلو مجلسِ شائقین میں آنے کا اذنِ عام تھا۔ ان میں بڑے صاحبِ علم، شاعر، ادیب، وکلا، جج، امرا، سیاستدان اور عام معمولی حیثیت کے لوگ بھی ہوتے۔ سب سے مساویانہ سلوک ہوتا۔ مجلس میں علامہ اقبال سے ہر طرح کے سوالات پوچھے جاتے۔ علامہ اقبال کی وسعتِ علمی اور ذہانت و حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ ہر سوال پر ایسی ماہرانہ گفتگو کرتے گویا پہلے سے تیار کر رکھی ہو۔ اور ایسی اعلیٰ و بلند پایہ گفتگو کرتے گویا علمی جواہر پارے ہوں یا آبشار

ہو۔ جو لگاتار رواں دواں ہو۔ بعض اوقات موضوع پر سیر حاصل گفتگو کر چکتے تو کہتے کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھ سکتا ہوں۔ یہ مثال صرف ان کی گھریلو مجالس تک محدود نہیں جب یورپ اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے۔ تو وہاں بھی وہ اپنی ذہانت، حاضر دماغی کی وجہ سے نہایت مقبول و مشہور ہو گئے۔ جب کہ کیمبرج میں اُن کے تمام اُستاد ان کی لیاقت کی وجہ سے اُن کے دوست بن گئے۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے دوران اُن کی اپنے استاد سر تھامس آرنلڈ سے دوستی ہو گئی۔ اقبال انگلینڈ گئے تو وہاں بھی آرنلڈ سے ملاقات رہتی، ایک دفعہ آرنلڈ نے اپنے گھر مذاکرے کا انتظام کیا۔ جس کا موضوع تھا Life after death۔ بڑے عالم فاضل لوگوں نے موضوع پر اپنے خیال کا اظہار کیا۔ آرنلڈ نے اقبال کو کہا کہ تم بھی کچھ کہو۔ تو اقبال نے صرف ایک جملے میں تمام موضوع کو واضح کر دیا اور اس کے بعد محفل اختتام پذیر ہو گئی۔ اُن کا جملہ یہ تھا: Life is beginning of death and death is beginning of life۔

اس خیال کو علامہ نے اُردو کے شعر میں یوں کہا ہے:

موت کو کہتے ہیں غافل، اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

لندن میں مجلس زندگی کی کیفیت اقبال نے اس طرح بالِ جبریل کے شعروں میں کہی ہے:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی
کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

اقبال کی اس علمیت اور حاضر جوابی کو اُن کی دوست عطیہ فیضی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اقبال کی حیرت انگیز ذہانت اور حاضر جوابی سے اقبال ہر محفل پر چھا جاتے۔ اور اُن کی پُرلطف گفتگو سے حاضرین بہت لطف اندوز ہوتے۔ اور جب کبھی وجدانی کیفیت طاری ہوتی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ماورائی اسرار و رموز تک پہنچ جاتے۔

مجلسی زندگی کا یہ احوال لکھنے کا راقم کو اس غم محرومی سے خیال آیا کہ اگر اقبال کے وقت گفتگو ریکارڈ کرنے والی مشینیں ہوتیں یا مشہور انگریز سکالر ڈاکٹر سیموئیل جانسن جو انتہائی ذہین

اور اعلیٰ پائے کا متکلم تھا اُس کی طرح جیمز باسول (James Boswel) جیسا گفتگو ریکارڈ کرنے والا ہوتا جس نے ڈاکٹر جانسن کی گفتگو کے نوٹس لے کر چھپوائے اور اُسے اور خود دونوں کو لافانی کر دیا۔ اقبال کے ان مجلسی جواہر پاروں کا اگر ریکارڈ ہوتا تو ہم لوگ بلکہ ہر ملک کے لوگ ان سے کہیں قدر مستفید ہوتے اور ہمارا علمی سرمایہ کتنا وسیع ہوتا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اقبال جب مشہور فلسفی برگساں اور اٹلی کے حکمراں مسولینی وانگلینڈ و مصر اور ایشیا کے کئی مشاہیر سے ملے تو وہ سب اقبال کی عالمانہ گفتگو سے بے حد متاثر ہوئے۔ افسوس کہ اقبال کے آئینہ گفتار کے اس دلآویز عکس سے ہم محروم رہ گئے ہیں۔

ایک اور بہت بڑی محرومی جس سے ہم دوچار ہوئے وہ یہ ہے کہ اقبال بے حد درویشانہ، فقر و غنا طبع رکھتے تھے۔ ہر وقت قوم کے معاشی، تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی، ثقافتی مسائل کے بوجھ تلے زندگی بسر کرتے ہوئے وہ اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات، خوراک، آرام، سکون سے غافل رہتے اور ہمت سے زیادہ کام کرتے اور وہ بھی جس سے مالی فائدہ ہونے کی بجائے نقصان ہوتا۔ اس طرح بیمار ہوئے تو ناکافی علاج و احتیاط ہونے کے سبب بیماریاں بڑھتی گئیں اور لاعلاج ہونے کے سبب صرف اکسٹھ برس کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئے۔ المیہ یہ ہے کہ جو علمی مخزن وہ چھوڑ گئے ہیں وہی ہمارے لیے بحرِ بیکراں ہے مگر وہ پیمبرانہ بصیرت کے مالک تھے۔ اُنھوں نے مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ اسلام جو صدیوں پرانی تفاسیر قرآنی، غیر فطری و زمانے کے غیر موافق زندگی گذارنے کے جامد اور دور از کار اصولوں پر اٹکا ہوا ہے۔ جس سے مسلمانوں پر سائنس، حکمت، طب، صنعت اور جدید فنون کے دروازے بند ہو گئے ہیں اور وہ غلامی، محکومی، افلاس، جاہلیت کا شکار ہو چکے ہیں اور آپس میں ہی فرقہ بندی کی وجہ سے لڑ جھگڑ کر اپنی قوت و صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں۔ اُن تمام موضوعات پر وہ حقیقت افروز کتب تحریر کریں۔ تاکہ مسلمان زمانے کے تقاضوں کے مطابق جدید علوم اور اپنے مذہبی اختلافات کو زمانے کی تبدیلی کو مدنظر رکھ کر ختم کر کے وسعتِ قلب و نظر سے مثبت عمل کو اپنائیں گے۔ اقبال کی نگاہ میں اسلامی دُنیا میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو قرآن حکیم ہے۔ اقبال کہتے تھے جس کو صحیح عربی نہیں آتی وہ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خاص فضل و کرم کیا ہے کہ میں قرآنی مطالب کی رُوح کو سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے ۱۵ برس قرآن

حکیم کو بغور پڑھا ہے۔ بعض آیات پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے۔ انھوں نے قرآن حکیم کی اہمیت کے مدنظر صحیح طور پر تشریح کی کتاب کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اقبال کی ان موعودہ کتابوں کا ذکر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون مشمولہ نقوش اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں کیا ہے۔ اقبال کی مجوزہ دوسری کتاب اسلامی فقہ کی تدوینِ نو پر تھی۔ ان کے خیال میں ائمہ کرام اور صدیوں پہلے محدثین کی لکھی ہوئی فقہ پر کتب اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہیں۔ فقہ کی تدوینِ نو "اجتہاد" کے بغیر ممکن نہیں۔ جس کی موجودہ سائنسی ترقی یافتہ زمانے میں جدید مغربی علوم و افکار اور صنعتی ترقی کے دور میں ضرورت ہے۔ اس کے لیے اجتہادِ فکر و عمل کی اشد ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کمی دور کرنے کا مصمم ارادہ کیے تھے اور کہتے تھے جو شخص یہ کام کرے گا موجودہ دور کا مجدد ہوگا۔

تیسری کتاب تاریخِ تصوف پر تھی کیونکہ اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد ملک میں اہلِ تصوف نے اقبال کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ جن میں زیادہ وہ لوگ تھے جو وجودی تصوف کے قائل تھے جو سراسر اسلام کی عملی و حرکی تعلیم کے خلاف ترکِ دُنیا اور فقر و درویشی کی آڑ میں نفس کشی اور دُنیاوی ترقی سے گریز کو اپناتے تھے۔ چونکہ وجودی تصوف کے بعض عقاید و مسائل قرآن کی روشنی میں غیر اسلامی تھے اس لیے اقبال ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو صحیح تصوف سے آگاہ کیا جائے۔ اس ضمن میں وہ ابن عربی (جو عقیدہ وحدت الوجود کے بانیوں میں تھے) کی متنازعہ مشہور کتاب فصوص الحکم پر اختلافی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اقبال نے کئی اہم موضوعات تصنیفات کے لیے سوچ رکھے تھے۔ عمر کے اس حصے میں اُن کے علم و فکر میں نہایت پختگی آچکی تھی۔ اگر قدرت ان تصانیف کو مکمل کرنے کے لیے عمرِ عزیز میں چند سال اور بڑھا دیتی تو اسلام کی تعلیمات کی صحت اور وسعت سے مسلمانوں کو بے حد

فائدہ پہنچتا۔ اور وہ زیادہ متحد، صحیح العقیدہ اور باعمل ترقی یافتہ ملت کے افراد ہوتے۔ اے کاش!

حرفِ آخر کے طور پر زیرِ نظر تصنیف کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ جملہ مضامین میں کوئی نئی دریافت یا فلسفہ نہیں پیش کیا گیا۔ یہ علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنے محدود علم کی حد تک پر دلی عقیدت اور محبت کا تحریری اظہار ہے۔ جو ان کے کثیر الجہت اوصافِ حمیدہ کے آئینہ خانے کے مختلف اہم موضوعات سے متعلق ہے۔ جن کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان کی روشنی میں اپنی زندگی کے لائحۂ عمل کو از سرِ نو ترتیب دے کر اپنی درماندہ قوم کے مستقبل کو سنوار سکیں۔

اس ناچیز راقم کے لیے یہ اعتراف باعثِ فخر و مسرت ہے کہ کتاب کے جملہ مضامین تحریر کرنے کے دوران میں اسے کئی بلند پایہ اصحاب و احبابِ علم و بصیرت کے فیضانِ قلب و نظر سے جو اقبال کی ذات مسودہ صفات سے انھیں عشق کی وجہ سے حاصل تھا۔ راقم بھی فیض یاب ہوا۔ جس نے مضامین کی علمی افادیت کو قابلِ توجہ اور موجبِ عمل بنا دیا ہے جو یقیناً قارئینِ کرام محسوس کریں گے۔ ان میں سے چیدہ اسمائے گرامی میں سرِ آغاز محترم ڈاکٹر نذیر قیصر، اقبال اور رومی کے فکر و فن پر ڈاکٹریٹ کے حامل اور اقبال کی کئی تصانیف پر بین الاقوامی سطح پر ایوارڈ یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ نہایت جید سکالر اور کثیر الجہت مخزنِ علوم انور علی بخاری پھر نہایت وسیع المطالعہ قاضی حسن معیز الدین ہیں۔ اور بین الاقوامی شہرت کے حامل مصورِ اقبال آرٹسٹ و ادیب اسلم کمال اور شہزادہ کبیر احمد (ر) جج کئی ادبی و ثقافتی انجمنوں کے بانی ہیں۔ علاوہ ازیں محترمہ عطیہ سید معلمِ فلسفہ کے صدارتی عالمانہ خوشگوار خطبات اور محاکمات ہیں اور خاص طور پر جواں سال جواں ہمت ڈاکٹر شہزاد قیصر جو اعلیٰ پائے کے سکالر، مصنف، محقق و مقرر ہونے کے ساتھ نہایت خوش اخلاق ہیں اور ادارے "اقبال فورم انٹرنیشنل" کے فروغِ فکر و پیامِ اقبال کے اعلیٰ مقاصد کا فریضہ نہایت خلوص، محنت اور جانفشانی سے ادا کر رہے ہیں۔ آخر میں انگریزی مضمون "اجتہاد، اقبال اور پاکستان" کے لیے اپنے محترم دوست ڈاکٹر بشیر احمد ملک کا ممنون ہوں۔ جن سے مضمون لکھنے کی تحریک ملی اور استفادہ کیا۔ جو وقت کی پکار ہے۔ جملہ احباب کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں جن کی مخلصانہ معاونت سے یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔

راقم کی دلی دعا ہے کہ جملہ اقبالیات نظم ونثر جو قرآن حکیم کا اُردو فارسی میں مسلمانوں کے لیے آسان زبان میں بہترین لائحہ عمل ہیں اور کردار سازی کے لیے رہنما بھی۔ انھیں طالب علموں کے تعلیمی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ خدا کرے متعلقہ اربابِ اختیار اور اہل علم و دانش اس طرف ضروری توجہ دیں۔ تاکہ تمام مسلمان اسلامی اقبالی قوم بن جائیں۔ آمین

دیکھیے اس بحر کی موجوں سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

علامہ اقبال اور اہم معاشرتی مسائل

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال کو ترقی یافتہ وعلمی دنیا میں ایک عظیم شاعر، فلاسفر، دینی، سیاسی، معاشی و معاشرتی رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی الہامی شاعری میں تمام عالم انسانیت کی فلاح اور سربلندی کا پیغام ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں اسلامیانِ عالم کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کی طرف جھکاؤ زیادہ نمایاں ہے۔ مگر اس میں مصلحت یہ ہے کہ آج کل کے مختلف باہم برسر پیکار نظام ہائے زندگی جو فکری، نسلی، علاقائی و طبقاتی نفرتوں اور عداوتوں سے دنیا کو جہنم زار بنا رہے ہیں اور طالع پسند حکمران، با اثر سرمایہ دار و جاگیر دار نام نہاد جمہوریت کی آڑ میں عام آدمی کی محنت و مشقت مکر و جبر کی چالوں سے استحصال کر کے انھیں مزید غربت، جہالت، بے چارگی اور ذلت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ انھیں اسلام کے دیئے ہوئے جہانبانی اور معاشرے میں باہم ربط وضبط کے احسن اصولوں کی روشنی میں مذکورہ بالا استحصالی طبقات کے علاوہ شدت پسند اور تنگ نظر نام نہاد مذہبی رہنماؤں کی متعصبانہ سوچ اور معاشی و معاشرتی بدحالی اور جہالت سے آزادی دلا کر زندگی میں مثبت فکر و عمل کے ذریعے باوقار مقام دلایا جا سکے۔

اس ضمن میں اقبال کی مشہور نظم "خضرِ راہ" ذہن میں آتی ہے۔ جس میں اس نے غیبی رہنما حضرت خضرؑ سے مکالمہ کی صورت میں چند نہایت اہم سوالات کے بارے میں وضاحت طلب کرنے کی غرض سے گفتگو کی ہے۔ (۱) زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ (۲) سلطنت کیا چیز ہے؟ (۳) سرمایہ داری اور محنت کیا ہیں؟ (۴) ان میں باہم آویزش اور تضاد کس وجہ سے ہے؟

اقبال معاشرے میں عالمی سطح پر خوشحالی، باہمی خلوص و محنت کا بے حد متمنی ہے۔ اس نظم میں اس نے نہایت خوبصورت، دل نشین انداز میں رہبر جہاں حضرت خضرؑ سے مکالمہ کے انداز میں گہرے فکر و اضطراب میں غرق سحر انگیز منظر پیدا کر کے شام کے گہرے سکوت میں

خاموش دریا کے کنارے اپنے دل میں تلاطم پیدا کرنے والے سوالات کا جواب دریافت کیا ہے۔ اس نظم کا آغاز دیکھیے

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہ تاب (۱)

شام کے گہرے سکوت کا یہ منظر دراصل اس دور کے جمود کی غمازی کرتا ہے جس کو توڑنے کے لیے اقبالؒ کے دل میں اک جہانِ اضطراب ہے ایسے پر اسرار سکوت، خاموشی کے عالم میں اچانک پیکِ جہاں پیما: خضرؑ نمودار ہوتا ہے جسے اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب (۲)

خضر کی جواں صورت پیری اور عالمی حقائق سے آگاہ شخصیت سے اقبالؒ عالمِ انسانی کے بارے میں مذکورہ بالا سوالات کے جوابات سے زندگی کی حقیقت دنیا میں طرزِ حکومت، سرمایہ اور محنت میں جنگ و جدل سے پیدا بے شمار مسائل جنھوں نے زندگی کو بھوک افلاس، جہالت، رنج و الم ظلم و استحصال کا عرصۂ کارزار بنا رکھا ہے۔ دُور کرکے ایک حسین پر امن اور پر مسرت

---

(۱) کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۲۵۵، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۳۸ء۔
(۲) ایضاً، ص ۲۵۶۔

جہاں کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ سب سے پہلے خضر، اقبال کی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے اپنے موجود ہونے کو ہی مثبت زندگی کی دلیل کے طور پر یوں پیش کرتا ہے۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل①
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی②

زندگی کے موضوعِ سخن کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے خضر یوں خطاب کرتا ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے③

صحیح زندگی گویا اقبال کے نزدیک ایک مسلسل عمل، عرصۂ مبارزت، جدوجہد، سوز و ساز، تب وتاب، کشمکشِ روز وشب کا مرقع ہے۔ یعنی:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں④

---

① کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۲۵۷۔
② ایضاً، ص ۲۵۸۔
③ ایضاً، ص ۲۵۸، ۲۵۹۔
④ ایضاً، ص ۳۳۹۔

کاروانِ حیات کا منزل کی طرف گامزن رہنا جس میں کوئی مستقل پڑاؤ نہیں ہے یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ اقبال کا خضر سے دوسرا استفسار ہے کہ سلطنت کیا چیز ہے؟
دنیا میں معاشرتی زندگی کے آغاز سے آج تک کئی طرح کے نظامہائے حکومت رائج رہے ہیں۔ جن میں زیادہ معروف ملوکیت، فاشزم، ڈکٹیٹرشپ، سوشلزم کمیونزم وغیرہ ہیں۔ مگر ترجیح کے لیے تان آ کر سرمایہ دارانہ نظامِ جمہوریت یا ڈیموکریسی پر ٹوٹتی ہے۔ یہ سب سے اعلیٰ، ارفع اور منصفانہ نظامِ حکومت ہے جس میں ہر شخص کو بذریعہ ووٹ حکومت میں شرکت کا حق دیا گیا ہے اور یہی نظام زیادہ تر اقبال کا ہدفِ تنقید ہے۔ ویسے تو اقبال کے نزدیک سب حکومتی نظاموں کی روح ایک جیسی ہے کہ جو بھی شخص یا گروہ یا خاندان برسرِ اقتدار ہو اس کا مقصد ہر حیلے سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا ہے جس کی حقیقت وہ خضر کی زبان سے اس طرح بیان کرتا ہے۔

میں بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری①

تاہم اقبال کو زندگی میں انگریزی جمہوری نظام سے واسطہ پڑا ہندوستان انگریزوں کا محکوم تھا مگر انھوں نے یہاں کے باشندوں کو جمہوری حکومت کے دلفریب ہتھکنڈوں میں الجھا دیا جسے خضر نے یوں بیان کیا ہے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری؟

---

① کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۲۶۰۔

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِّ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آفریں
اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تُو؟
آہ اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو[۱]

ان اشعار میں جمہوری نظام کی پُرکشش اصلاحات سے ظاہر ہے جیسے کہ مجلسِ آئین، قانونی اصلاحات، رعایات، حقوق، مجالس کی گرم گفتاری، آزادیٔ رائے کا حق الیکشن کی شعبدہ بازیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے غیر اخلاقی حربے الزام تراشیاں جس کا اقبال کو ذاتی طور پر ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں تجربہ ہو چکا تھا اور بھاری کامیابی کے باوجود انھوں نے آئندہ ہمیشہ کے لیے انتخاب لڑنے کو ترک کر دیا گویا یہ ایک ابلیسانہ نظام ہے اس کو انھوں نے ایک طنزیہ انداز نظم میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ابلیس کے پیروکاروں نے ایک دفعہ دیکھا کہ وہ بڑے مطمئن انداز میں فارغ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا ہے پیروکاروں نے پوچھا کہ کیا اس کا مشن دنیا میں برائیاں، فساد، جرائم وغیرہ پھیلانے کا پورا ہو گیا ہے؟ جس کے جواب میں ابلیس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اب اسے انگریزی پارلیمنٹ کے ارباب اختیار تم لوگوں سے بہتر انداز میں سرانجام دے رہے ہیں۔

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک[۲]

اپنے ملک کا موجودہ جمہوری دور حکومت محض کھوکھلے نعرے ہیں۔ بنیادی ضرورت با کردار لوگوں کو بلا تفریق امیری یا غریبی کے منتخب کرنے کی ہے جو اپنے فرائض ایمان داری سے سرانجام دیں۔ تا کہ ترقی کی رفتار رواں دواں رہے۔

چنانچہ یہ کہنا کہ مغربی جمہوری نظام سب سے بہترین ہے کہ اس میں سب کے مساویانہ حقوق ہیں سراسر جھوٹ اور فریب ہے۔ اپنے ملک میں انتشار زدہ نااہل سیاسی و حکومتی جماعتوں

---

[۱] کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۲۶۱۔
[۲] ایضاً ص ۵۴۳۔

کی طرف سے ایک نعرے کی اکثر تکرار کی جاتی ہے کہ بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے بہتر ہے جو قطعی ناقابلِ قبول ہے۔ کیونکہ یہ اقتدار پرست اربابِ سیاست نے دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹنے اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے وضع کیا ہے۔ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عبدالعزیز عمر ثانی کا طرزِ حکومت ایسی جمہوریت تھا؟ ان حکمرانوں کی کامرانی کی اصل وجہ اہلیت، دیانت، عدل اور فرض شناسی پر تھی جسے وہ بارِ امانت سمجھتے تھے اس کے علاوہ ان کے اصحابِ شوریٰ کی بڑی اہمیت تھی جن کی دانش اور اصابت رائے مُسلّم تھی۔ موجودہ دور میں اقبال کے نزدیک بھی جمہوری نظام دوسرے کمتر نظاموں سے بہتر ہے مگر اس کی شرط ہے کہ نمائندگان صحیح، نہایت قابل دیانتدار محنتی دوراندیش اور اپنے فرائض کو سمجھنے اور سرانجام دینے کے اہل ہوں اور سب سے زیادہ ضروری بات کہ نمائندگان عوام سے ہوں کہ نہ موروثی جاگیر دار سرمایہ دار(۱) خاندانوں سے ہوں اس حقیقت کو انھوں نے واشگاف انداز میں کہا ہے کہ

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو(۲)

موجودہ طرزِ حکومت ایسی فرسودہ لڑکھڑاتی ہوئی عمارت ہے جو اقبال کے نزدیک نقشِ کہن ہے اور گرائے جانے کے بعد نئی جدید عمارت انصاف وعدل و مساوات کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہو وہ مولانا روم کی حکمت پر یقین رکھتے ہیں جن کے بارے میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا آباداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند(۳)

مولانا روم کے قول کے مطابق موجودہ نظامِ حکومت فرسودہ، متروک ہو چکا ہے۔ یہ مغربی جمہوری نظام کی تقلید میں لیپا پوتی سے درست نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے قرآن اور سنت کے اصولوں پر مبنی [illegible] نظام کی ضرورت ہے۔ بقول اقبال:

---

(۱) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ص ۲۱۹۔
(۲) کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۳۰۲۔
(۳) ایضاً، ص ۳۰۲۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اقبال نے اپنی شہرہ آفاق کتاب جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی جنھیں وہ وقت کا مجدد مانتے ہیں کی زبانی فلک عطارد پر ملاقات کے دوران اسلامی حکومت کے خدوخال مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کرتے ہیں:

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را نہ اُو کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقل خودبیں غافل از بہبود غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف — وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

ان اشعار کا ترجمہ اس طرح سے ہے:

خلافتِ اسلامی میں مردِ مومن مقام و مرتبہ کی قید سے آزاد ہوتا ہے نہ کسی کو غلام بناتا ہے نہ کسی غلام بنانے والے کا اقتدار تسلیم کرتا ہے۔ مرد مسلمان درحقیقت آزاد زندگی گزارتا ہے۔ اس کا ملک بھی خداداد ہوتا ہے اور آئین بھی خداداد ہوتا ہے۔ اس کا دین، آئین طور طریقے نیک و بد کے پیمانے سب خدائی احکام کے تابع ہوتے ہیں وہ خود پرستی اور خود غرضی کی کثافتوں سے پاک ہوتا ہے کیونکہ ان کمزوریات کی حامل عقل دوسروں کی بہتری اور حقوق و فرائض سے غافل رہتی ہے یہ خداداد عقل حکمت و بصیرت ہی ہے جو سب کا فائدہ دیکھتی ہے اور بھلا چاہتی ہے امن کی حالت ہو یا جنگ کا زمانہ حق و صداقت کی تابع حکومت عدل و انصاف قائم کرتی ہے اور اس کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ کسی سے بے جا رعایت کرتی ہے۔ نہ طاغوتی عناصر سے ڈرتی ہے۔ (1)

سلطنت کے دلفریب عوامل کا پول کھلنے کے بعد اقبال نظم خضر راہ میں سرمایہ داری کو ہدف

---

(1) ڈاکٹر محمد ریاض، جاوید نامہ تحقیق و توضیح، ۹۰۔۹۱۔

مذمت بناتا ہے جس میں سرمایہ دار طرح طرح کے حیلوں ہتھکنڈوں سے مزدوروں کی جان توڑ محنت کا فائدہ خود اڑا لیتا ہے اور مزدوروں کو صرف اتنا حصہ دیتا ہے جس سے وہ تارِ حیات کو چلتا رکھے اور برے حال میں زندہ رہ کر سرمایہ دار کے لیے مزید دولت پیدا کرتا رہے۔ اس بارے میں چند اشعار دیکھیے:

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تری برأت
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات①

اقبال اپنے دور کے بڑے بڑے مفکروں سے ذہنی لحاظ سے زیادہ باخبر تھا اور سمجھتا تھا۔ وہ مجبور رہے تھے کہ غلام ہندوستان میں نفاذِ جمہوریت جس کا ماحصل چند سرمایہ داروں کے ذریعہ سلطنت برطانیہ کے تسلط کو استحکام بخشتا تھا سرمایہ دارانہ نظام ہی کا بدل ہے۔ ورنہ وہ جمہوریت کے زمانۂ عروج میں سرمایہ داری نظام کے خلاف محنت کش [illegible]وں کے استحصال کے متعلق اس طرح واشگاف آواز بلند نہ کرتا جس سے صنعتی انقلاب [illegible] پیدا شدہ بیمانہ ظلم میں یورپ، ہندوستان بلکہ جہاں جہاں مغربی طاقتوں نے نوآبادیاں [illegible] مزدوروں غریبوں، مزارعوں میں مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سرمایہ داروں [illegible] تھوپے انسانیت کش ظلم کی وجہ سے سسک سسک کر جی رہے تھے۔ اس بے بس مخلوق کے حقوق [illegible] اور بیچارگی کا مداوا کرنے اور رونے والا کوئی نہ تھا۔ نہ مذہب، نہ قانون، نہ شرفیہ [illegible] کا ردعمل اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوا جو کارل مارکس کے اقتصادی اور معاشی [illegible] اور حصولِ حقوق کا [illegible] عمل

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۶۲۔

تھا۔ اس منشور میں مذہب کی کوئی جگہ نہ تھی۔ جس نے ہمیشہ حکمران اور جابر طبقے کا ساتھ دیا اور مظلوموں کو تقدیر پر شاکر رہنے کی تلقین کی کہ دنیا میں دکھ، تکلیفیں سہنے والوں کو اگلی زندگی میں اعلیٰ مدارج حاصل ہوں گے۔

علامہ کے نزدیک اشتراکیت نے کلیسا کے حمایت یافتہ سرمایہ داری نظام کی تخریب کا کام نہایت کامیابی سے کیا جس نے سلطانی، جاگیرداری، کلیسائی خواجگی کا خاتمہ کر دیا بلکہ اشتراکیت کے مساوات پر مبنی اصولوں کی اس نے یہاں تک تعریف کی اگر اشتراکیت میں الحاد نہ ہو اور لا کے بعد الا اللہ شامل کر دیا جائے تو یہ نظام اسلام کی شکل اختیار کر جاتا ہے مگر چونکہ الحاد صرف جسمانی فلاح پر زور دیتا ہے اور خدا کی ذات اور روحانی فلاح کا یکسر منکر ہے اور الحاد پر سختی سے کاربند ہے۔ اس لیے اقبال بغیر خدا کے صرف تن پرور معاشی نظام کو قبول نہ کر سکا تاہم اقبال اپنی مشہور نظم "لینن" (خدا کے حضور میں) اسے خدا کے حضور پیش کر دیتا ہے جو مذہب کلیسا کے امیر اور غریب کی قسمت کے تضاد کو الحاد اختیار کرنے کا عذر کرتا ہے۔ جسے چند اشعار میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ (۱)

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (۲)

اور آخر میں لینن کی زبان سے خدا سے غریبوں کے لیے اس طرح انصاف طلب کرتا ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۱۹۵-۲۰۱۔
(۲) کلیات اقبال اردو، ص ۳۹۹۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات (۱)

روس میں زارشاہی اور کلیسا کے انسانیت کش گٹھ جوڑ کے خلاف کامیاب انقلاب لانے پر اقبال لینن کے کارنامے کو بنظرِ تحسین دیکھتا ہے اور شدید خواہش رکھتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام [illegible] میں جہاں کہیں ہے اس کو مٹا دیا جائے۔ تاکہ اس سے انسانیتِ عالم کو جبر و استبداد، استحصال [illegible] غلامی کی ذلت و رسوائی سے نجات حاصل ہو وہ اپنی اس آرزو کو مندرجہ ذیل نظم "فرمانِ خدا" [illegible] ایک طرح سے ملوکیت، جاگیرداری اور فرسودہ مذہب کے خلاف اعلان جنگ ہے اس میں خدا فرشتوں کو زمین پر ہونے والے مظالم کو مٹا ڈالنے کا حکم دیتا ہے۔

فرمانِ خدا

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو (۲)

یہ نظم ایک طرح سے اشتراکیت کا جامع منشور ہے۔ جو اشتراکی حکام ضرور اپنا [illegible] نظم کا عنوان "فرمانِ خدا (فرشتوں سے)" نہ کیا جاتا۔ کیونکہ اشتراکیت کے بانیوں نے کلیسا [illegible] رئیسوں کی بجائے [illegible] اور ورائی نظریات پر پہلے ہی کلہاڑا چلا کر انھیں اشتراکی فلسفہ سے نکال

(۱) کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۰۔
(۲) کلیاتِ اقبال اردو ص ۳۱۔

دیا ہے۔ کیونکہ مذہب کے ٹھیکیداروں کو آلہ کار بنا کر ہی جابر مطلق العنان حکمران اور مقتدر طبقات عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے اور ان کی محنت سے پیدا شدہ دولت کو لوٹ لیتے تھے اور ہیں یہاں اشارۃً ذکر کرنا مناسب لگتا ہے کہ اس وقت اپنے ملک میں بھی سرمایہ دار اور محنت کش طبقات افراط و تفریط کی ناہمواری کے مظہر ہیں۔ ایک طرف بڑے زمیندار، جاگیردار، بیوروکریٹس، صنعت کار کی آمدنی اوج ثریا تک پہنچی ہوئی ہے جس میں مزید کی خواہش رہتی ہے دوسری طرف مزدوروں کی آمدنی صرف چند ہزار روپے مقرر ہے جو صنعتکاروں کے نزدیک زیادہ ہے کہ اس سے ان کے منافع میں کمی آتی ہے۔ اقبال نے ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں منتخب ہونے پر اسمبلی میں پرزور تقاریر سے واضح کیا کہ امیر غریب کی آمدنی میں فرق کم کرنا معاشرے کے استحکام اور ملکی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے اگر ارباب علم و اختیار نے جلدی توجہ نہ کی تو لینن کی طرح کوئی معاشی ظلم اور ناانصافی کے روز مکافات کے لیے ظہور پذیر ہو جائے گا۔ اہل خرد کی آگہی کے لیے اقبال کا یہ شعر پیشگی اطلاع کا حامل ہے:

فطرت افراد سے اغماز بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس ضمن میں سرمایہ داری کے موضوع پر اقبال کے چند مزید اشعار درج ذیل ہیں:

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انسان نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کار زاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے [1]

---

[1] کلیات اقبال اردو ص ۲۷۲۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے①

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اب دیکھیں زمین کی ملکیت کے بارے میں اقبال کا کیا نظریہ ہے؟

اسلام میں ایک بڑا مسئلہ زمین کی ملکیت کا ہے موجودہ حالات میں سرمایہ داری نظام کے تحت مزارعوں، محنت کشوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بدترین صورت ہے۔ اقبال جو ایک سچا مسلمان اور الارض للہ کی روشنی میں یہ یقین رکھتا ہے کہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اس کی حیثیت ہوا اور پانی کی سی ہے جس پر کسی کی بھی ملکیت نہیں ہونی چاہیے اگرچہ زمین انسان کی محنت کے بغیر خوراک پیدا نہیں کرتی مگر انصاف کی رُو سے پیداوار کا فائدہ اسی کو ہونا چاہیے جس نے اس پر ہل چلا کر آبیاری کی اور فصل اُگائی ہو۔ زمین کا غیر حاضر مالک اس کے لیے کچھ نہیں کرتا پھر وہ کس بنا پر اس کا کثیر حصہ وصول کرتا ہے ملکیت زمین کے بارے میں اسلامی فقہا کے درمیان ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کی آڑ میں شاہوں، سرداروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں نے اپنی قابض شدہ زمین کو خدا کی عطا کردہ ملکیت قرار دیا ہے۔ حالانکہ انفاق کی ہدایت کے تحت ان کے پاس زائد وسائل بے آسرا لوگوں کی امانت کہے گئے ہیں۔

اس بارے میں ہر مفکر اپنے مطلب کی آیت اور احادیث لے لیتا ہے زمین کے بارے میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے۔ "اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ" یعنی زمین اللہ کی ہے۔ لہٰذا اس کی ذاتی

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۴۱۵۔

ملکیت جائز نہیں اس کے مخالف یہ حوالہ دیتے ہیں "لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کہ زمین اور آسمانوں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا اس لیے وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا لیکن یہ سب کچھ خدا کا ہونے کے باوجود باقی تمام اشیاء میں اسلام نے ذاتی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔

اقبال نے "جاوید نامہ" میں اس مسئلے کو سید جمال الدین افغانی کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ "الْاَرْضُ لِلّٰہِ" کہا گیا ہے اور زمین کو انساں کے لیے امانت اور مفید متاع قرار دیا ہے۔ اس امانت سے رزق رہائش اور قبر کا استفادہ کرتا رہا ہے اس کے علاوہ زمین سے بیوپاری اور ہوس ملکیت درست نہیں۔ اس بارے میں اقبال کی مشہور نظم ① بال جبریل سے بعنوان "الْاَرْضُ لِلّٰہِ" پیش خدمت ہے:

الْاَرْضُ لِلّٰہِ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نور آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں ②

اس مختصری سے مثال نظم کا مدعا یہی ہے کہ اقبال زمین کی عظیم ملکیتوں کے خلاف تھے۔ وہ فاتح بادشاہوں کا حق تسلیم کرتے تھے نہ ان کی اپنے زیر اثر سرداروں کو جاں نثاری کے صلے میں جاگیریں اور نہ سرمایہ داروں کے وسیع قطعات پر قبضہ دلا کر ان پر مزارعوں کے ذریعے

---

① ڈاکٹر محمد ریاض، جاوید نامہ (تحقیق و توضیح)، اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور، ص ۹۱-۹۲۔

② کلیات اقبال اردو، ص ۴۱۱۔

دولت سمیٹنے کو جائز سمجھتے تھے کیونکہ غیر محدود اراضی کے حقوق، سرمایہ داری، عیش پرستی، اور ظلم و استحصال کو فروغ دیتے ہیں۔ اسلام نے اسے قانونِ وراثت سے روک دی تھی لیکن نام نہاد جاگیرداروں نے تقسیم وراثت کے بجائے نیابت کو اپنایا۔ یہ جمہوریت کے لباس میں بدترین آمریت اور جاگیرداروں کے تسلط کی وجہ سے ہے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بھی زمین کی ملکیت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ جب قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں روم اور فارس میں اسلامی مجاہدین کی فتوحات سے وسیع و عریض مفتوحہ علاقے زیرنگین آگئے تو بعض سرکردہ مجاہدین اور صحابہ کرامؓ نے مفتوحہ زمینوں کو مالِ غنیمت کی طرح فاتحین میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کردیا۔ اس سے پہلے ایسی صورت پیش نہیں آئی تھی۔ مگر عمرؓ کے عادلانہ ذہن نے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا انھوں نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں اس مطالبہ کو سراسر ناجائز قرار دیتے ہوئے کہا تم لوگ خود اور اپنی اولاد کو مفتوحہ زمینوں کے مالک بن کر بغیر کوئی محنت، مشقت کے جاگیردار بن کر ان کے اصل مالکوں کی محنت کا ثمر لوٹ کر عیش و عشرت کرنا چاہتے ہو جنھوں نے نسلوں سے اپنی محنت سے ان کو آباد کیا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز جنھیں عمر ثانی بھی کہا جاتا ہے انھوں نے اپنے پیش رو خلفاء اور ان کے اور اپنے اقربا سے لوگوں کی زبردستی چھینی ہوئی زمینیں انھیں واپس کر کے ان کی ملکیت بحال کی۔

یہ انتہائی المناک حقیقت ہے ہمارا ملک جو اللہ تعالیٰ کے عادلانہ نظام کے نفاذ کے لیے بنا تھا۔ تاکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک مضبوط مستحکم، ایثار کرنے والا معاشرہ تشکیل دیا جائے۔ آج تک زمین کے مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے بجوں کا توں بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو صرف زمین کی ملکیت کے نام پر غریب و مجبور مضارعوں کی محنت، مشقت پر داد عیش دینے اور کمزوروں کے استحصال کو تحفظ دیتا آرہا ہے۔ جس سے طبقاتی تقسیم کے اندیشے شدید تر ہوتے جارہے ہیں اور ملکی معیشت اور قومی اتحاد تباہ ہو رہے ہیں کاش کہ وہ غیر مسلم دشمن بھارت سے ہی سبق لے لیتے جس نے ہندوستان تقسیم ہوتے ہی جاگیرداروں اور ریاستی حکومتوں کا خاتمہ کردیا اور آج ایک تیزی سے ترقی کرتا ہوا ملک بن گیا ہے۔

زمین کی ملکیت کے بارے میں اقبال نے ایک خط بنام مولانا راغب احسن کو ۱۹۳۴ء میں لکھا۔ اس کے متعلقہ مندرجات مختصراً عرض ہیں۔ قرآن میں زمین کے بارے میں کئی بار آیا

ہے۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ" حضرت آدمؑ سے بھی کہا گیا کہ یہ تمھارے لیے مستقر اور متاع ہے۔① یعنی زمین برتنے کی چیز ہے، اسلام کے نزدیک زمین صرف اللہ کی ملکیت ہے۔ مسلمان صرف اس چیز کا امین ہے۔ جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی مسلمان اپنی پرائیوٹ زمین کا غلط استعمال کرے تو حاکمیت اسلامیہ کا حق ہے کہ وہ اس بارے میں اس سے باز پرس کرے۔②

امام ابو یوسف سے خلفاء عباسیہ میں سے کسی نے زمین کی ملکیت کے متعلق فتویٰ طلب کیا تو انھوں نے فرمایا کہ زمین اس کی ہے جو اسے زندہ رکھ سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام کے نزدیک زمین کا مالک وہ ہے جو اسے محنت سے کاشت کرتا ہے نہ کہ وہ شخص جو گھر میں بیٹھا ہے۔ مسلمان عام طور پر عقائد پر بحث و فتویٰ بازی کرتے رہتے ہیں مگر اسلام کے معاشرتی نظام کی طرف سوائے شاہ ولی اللہ کے سوا کسی نے توجہ نہیں کی۔ موجودہ زمانے میں اسلام کے معاشرتی نظام پر ریسرچ کی از حد ضرورت ہے۔ بحیثیت مذہب اسلام کی کامیابی کا دارو مدار اس پر ہے کہ اسلام کے معاشرتی نظام کی افضلیت زمانہ حال کے نظاموں پر ثابت کی جائے یورپ سے اسلام کی جنگ تلواروں سے ہوتی تھی، مگر اب معاشرتی نظاموں کی جنگ ہے۔ میری ناقص رائے میں اسلام حقیقی طور پر ابھی تک بے نقاب نہیں ہوا۔③

میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ قرآن نے تقسیم جائیداد کے متعلق جو قاعدہ دیا ہے وہ صرف منقولہ جائیداد کے لیے ہے۔ زمین پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ گویا اقبال زمین کی ملکیت کو خود کاشت کرنے والے یا اجتماعی یعنی اس کا انتظام و انصرام حکومت کی ذمہ داری سمجھتے ہیں تا کہ قومی سطح پر اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

آخر میں ایک اور موضوع جسے اقبال اہم سمجھتے تھے وہ علم و حکمت کی تعلیم ہے جس میں سائنسی علوم بھی شامل ہیں۔ حصول علم کو اقبال خیر کثیر کہتے ہیں۔ جس کی طرف اسلامیان عالم کو اسلامی تعلیم کا روشن پہلو سمجھ کر غایت درجہ فروغ دینا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک سائنسی علوم غیر

---

①

② ڈاکٹر محمد ریاض، جاوید نامہ (تحقیق و توضیح)، اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور، ص ۹۱-۹۲۔

③ ایضاً، ص ۹۳۔

معمولی طور پر موثر و مفید ہیں۔ اس ضمن میں موزوں لگتا ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کا مختصراً ذکر کیا جائے جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کے لیے سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کا کتنا احساس رکھتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ترکی کو شکست ہوئی۔ فاتح حکومت برطانیہ اور دیگر اتحادیوں نے سلطنت ترکیہ کے وسیع زیر نگیں علاقہ جات کے ٹکڑے کر کے بندر بانٹ کر لی۔ ترک خلافت ختم ہو گئی۔ جس کا ہندوستانی مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ علی برادران، مولانا آزاد اور دیگر ہمنواؤں کی سرکردگی میں بحالی ترک خلافت چلانے کا فیصلہ ہوا۔ جس میں یہ اقدام بھی تھا کہ قائم شدہ مسلم اداروں، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور کی بجائے جامعہ ملیہ قائم کیا جائے۔ جس کی سربراہی کے لیے علامہ اقبال کو پرنسپل کے عہدہ کی پیشکش کی گئی۔ یہ جذباتی تجزیہ مسلمانوں کے حصول تعلیم کے موجودہ نظام کے لیے تباہ کن تھی۔ مہاتما گاندھی مسلمانوں کا ہمدرد بن کر تحریک بحالیٔ خلافت کا مرکزی رہنما بن گیا۔ اس نے اقبال کو پرنسپل جامعہ ملیہ کا عہدہ قبول کرنے کی سفارش کی۔ اقبال کی وجدانی بصیرت نے گاندھی کی رہنمائی اور تحریک کے انجام کو فوراً محسوس کر لیا اور تحریک کی کھلی مخالفت کی۔ اور گاندھی کو بھی پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے سے معذرت کر لی اس کے ساتھ اپنے خط ۲۹-۱۱-۱۹۲۰ کے متعلقہ اقتباس میں اس طرح لکھتے ہیں:

"ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان میں سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے اور اقتصادی لحاظ سے ہندوستانی مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں، بلکہ ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت ہے جس کی بنا پر انھیں معاشی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اس لیے فی الحال انھیں اپنی اپنی صلاحیتیں اور توجہ اسی موخر الذکر طریقۂ تعلیم پر مرکوز کرنی چاہیے۔ جن معزز حضرات نے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی ہے انھیں چاہیے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبی علوم کے ٹیکنیکل پہلو پر زور دیں اور اس کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔"[1]

---

[1] اقبال اور جامعہ ملیہ، از عبداللطیف اعظمی، رسالہ جامعہ نئی دہلی، جنوری۔ مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۹۔

چلتے چلتے اقبال کی مشہور نظم "جاوید کے نام" جو لفظی و استعاراتی لحاظ سے نہایت پر اثر ہے، کے دو اشعار جو سائنسی اور ٹیکنیکل ترقی کے لیے "جاوید کو خطاب" کے ذریعے تمام جوانانِ ہند کے نام ہیں ایک لمحہ کے لیے دیکھتے ہیں:

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کا احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

پہلے شعر میں سکوت لالہ و گل سے کلام کرنے کے استعارے میں فطرت کی اشیا سے سائنسی علوم سے استفادہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور دوسرے میں اپنے ملک کی خام اشیا سے فنی ہنر مندی سے ایجاد کرنے کی تحریک ہے تا کہ فرنگ یا غیر کی محتاجی نہ رہے۔ مگر اس کا حقیقی فائدہ نوعِ انسانی کو اس وقت مل سکتا ہے جب اس میں ابلیسیت اور طاغوطیت نہ ہو اور یہ انسانی دردمندی اور محبت کی محکم بنیاد پر استوار ہو۔ اقبال بزبان سید جمال الدین افغانی کہتے ہیں کہ سوزِ دل اور انسان دوستی کی سائنس پیغمبرانہ منہاج رکھتی کیونکہ اس کی شیطانیت کو شمشیرِ قرآن نے کاٹ رکھا ہے۔ اور اس میں جلال کے ساتھ جمال کی قوت دکھائی دیتی ہے نہ کہ اسے صرف مخالفین کی تباہی و بربادی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اقبال بزبان سید جمال الدین افغانی متاسف ہیں کہ اسلام نے ملوکیت قیصر و کسریٰ کو مٹایا تا کہ عوام کے وقار کو تحفظ ملے مگر انھوں نے خود ملوکیت اپنالی جو چاہے شخصی جبر و استبداد کی شکل میں ہو یا سرمایا اشتراک کی صورت میں پارٹی کی ملوکیت ہو گویا۔ (۱) یہ بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حیلوں کا اثر ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح فرہاد، پرویز کی حیلہ بازی سے اپنے ہی تیشے سے مرا۔ مزدور نے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت میں اشتراکیت کو اپنالیا جو سرمایہ دارانہ نظام کی بدتر صورت ہے بس نام مزدور کی حکومت کا ہے یعنی:

---

(۱) ڈاکٹر محمد ریاض، جاوید نامہ، ذکر حکمت، دانش متعلقہ تعلیم سائنس ص ۹۳۔

نظامِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا؟
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی ![1]

یعنی سیاست کو چند افراد یا طبقات کے ہاتھوں میں نہ رہنا چاہیے کہ وہ اپنی خواہش کو قانون کا درجہ دے ڈالتے ہیں اور کروڑوں انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کر رہے ہیں۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لہٰذا دنیا کے دانشوروں کو قرآن حکیم کی تعلیمات کی طرف توجہ کرنی چاہیے جس نے آقائیت مٹائی اور بے نواؤں کی مدد کی۔ ارتکازِ زر کی حوصلہ شکنی کی اور انفاق کی تعلیم دی قرآن نے ربوا کو ختم کیا اور قرضِ حسنہ کی حوصلہ افزائی کی زمین کو خدا کی ملکیت بنایا لیکن اس سے جائز فائدہ اٹھانے کا حق دیا۔ اس نے انسانوں کو نعمتوں کا امین بنایا تا کہ دوسروں کی مدد کر کے معاشرے میں محبت اور بھائی چارہ بڑھائیں اور معاشرے میں مضبوطی اور استحکام پیدا ہو۔ قرآن حکیم نے مذہبی پیشواؤں، کاہنوں، پوپوں پروہتوں کے استحصال کا خاتمہ کیا۔ کتاب اللہ کا ظاہر، باطن، ناطق غیر مبہم زندہ و پائندہ ہے اس میں برائیوں کے خلاف جہاد اور ضرورت سے زیادہ دولت مندوں کو انفاق کی تعلیم دی ہے اور آخر میں یہ تلقین کی ہے کہ قرآنی تعلیمات کو صحیح عمل سے زندہ رکھا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کی بقا کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ بصورت دیگر اللہ تعالیٰ قادر و عادل ہے بے نیاز ہے وہ بہتر عمل والی قوم کو مسلمان پر حاکمیت دے سکتا ہے جیسا کہ اس وقت سب کو نظر آ رہا ہے اور اس کا حل یہی ہے جو حکیم الامت فرما گئے ہیں:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

---

[1] کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۳۲۔

مولانا روم اور علامہ اقبال

ساتویں صدی ہجری اسلام کے لیے نہایت پُر آشوب اور ہولناک دور تھا۔ جو شمشیر و سناں اوّل کے فاتحانہ دور سے گزر کر طاؤس و رباب آخر کے عیش پرستی، فسق و فجور اور زوال کے گرداب میں گھر چکا تھا۔ جان و مال و عزت کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ معاشرہ بے یقینی، بیچارگی، مایوس و خوف و ہراس کا شکار تھا۔ طوائف الملوکی تھی۔ قتل و غارت گری عام تھی۔ اخلاقی دیوالیہ پن کا تسلط تھا۔ خوارزمی، غوری، غزنوی و سلجوقی پُرشکوہ مسلم سلطنتوں کی باہم جنگ و جدل نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ علماء فضلا بھی اس کا شکار ہو گئے۔ شیعہ، سنی و دیگر فرقے فساد کے باعث برباد ہو رہے تھے۔ اس پر تاتاری یلغار نے دنیائے اسلام کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا۔ علوم وفنون کے مراکز ملیامیٹ ہو گئے۔ ثمرقند، بخارا، بلخ، رے ہمدان، نیشاپور، عروس البلاد، بغداد ہلاکو خاں کی وحشی فوجوں کے ہاتھوں تباہ و برباد و خاکستر ہو گئے۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ جو مسلم دنیا کے اتحاد کی روحانی علامت تھا۔ پاؤں تلے روند کر ہلاک کر دیا گیا۔ تاہم اس ہولناک بربادی و آشفتگی کے دور میں اسلام کے علمی وقار کو خدا نے دین کے کچھ برگزیدہ مشاہیر جن میں مولانا روم بھی شامل تھے کے ذریعہ قائم رکھا۔ مگر مجموعی صورت حال نہایت ابتر تھی۔ کیونکہ شوقِ تحصیلِ علم، علمی تحقیق سے بے رخی، ذوق قوت اختراع و جدت سے بیگانگی، علم میں کمی، قوت مدافعت کی کمزوری، ماضی کے کارناموں پر بے جا افتخار نے اسلامی شان و شوکت و جاہ و جلال کا پول کھول دیا۔ ایسی مایوس کن صورتحال میں نوشتۂ تقدیر کو قضاء مبرم اور دنیائے فانی سے بے رغبتی اور خانقاہی تصوف میں پناہ و روحانی طمانیت تلاش کی جانے لگی۔ چنانچہ ذات کی نفی اور الوہیت سے وصال و زندگی کے معاشی و معاشرتی تقاضوں سے فرار کے نتیجہ میں حصول علم اور خود اختیاری کی سعی اور ارادہ و عمل کو مذموم اور قرب الٰہی سے دوری کا

سبب سمجھا جانے لگا۔①

مولانا روم نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا۔ انھوں نے دیکھا کہ سقوطِ بغداد کے بعد قوم نے زندگی کا منفی پہلو اپنا لیا ہے اور اپنی شکست، ذلت اور پستی کو تقدیر کا اٹل فیصلہ سمجھ کر بہتری کی امید چھوڑ چکے ہیں۔ مولانا روم نے اُن میں قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے وسیع علم اور مثبت عمل سے زندگی کے روشن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی۔ خود کو فنا فی اللہ کرنے کی بجائے بقاء ذات کے لیے خدمتِ خلق، حسنِ عمل و جدوجہد کو شعار بنانے کی ترغیب دی۔ عقیدۂ جبر و بے اختیاری کے بجائے قدر کا پہلو اجاگر کیا کہ انسان کو حدود کے اندر با اختیار اور نائب حق بنایا گیا ہے جہالت کے اندھیروں کو علم کے حصول، تحقیق و تخلیق سے دور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ ترکِ دنیا، خلوت گزینی، جذب و مستی و بے عملی کی بجائے عبادات کے ساتھ، بنیادی فرائض کی ادائیگی اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی تلقین کے ساتھ تعمیری و تخلیقی کارہائے نمایاں کرنے کا شوق دلایا۔ اقبال نے دیکھا کہ رومیؒ نے اپنے بے کراں علم و عرفانِ ذات و وجدانی بصیرت سے اپنے دور کے مسائل و فتنوں کا علاج کیا۔ اقبال کو اپنے زمانہ کے مسلمانوں میں ایسے ہی منفی پہلو نظر آئے جن کا علاج رومی کی تعلیمات کی روشنی ہی میں ممکن تھا۔ چنانچہ انھوں نے برملا کہا کہ رومی کی طرح میں بھی اپنے دور کے مسائل و فتنوں کا علاج کروں گا۔ پھر اقبال نے دیکھا کہ رومی اور کچھ دیگر صاحب عزیمت کردار علما و صوفیا کی تعلیمات کے اثر سے فاتح تاتاری مفتوح ہو کر خود ہی آغوشِ اسلام میں گر گئے اور اسلامی عظمت کے محافظ بن گئے جس پر اقبال نے متاثر ہو کر کہا:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ اقبال نے مولانا روم کو اپنا مرشد معنوی تسلیم کر لیا اور انھی کے زیرِ اثر فلسفۂ خودی کو تشکیل دے کر اپنے دور کے مسلمانوں کو تکمیلِ خودی کی دعوت دے کر بیدار کیا۔ اور انھیں غلامی

---

① ڈاکٹر افضل اقبال، مترجم بشیر محمود اختر، زیرِ عنوان، ایشیا کی اسلامی ریاستوں کی کیفیت، ص ۲۱-۳۸۔

سے نجات کے لیے آزاد وطن کے حصول اور روشن مستقبل کے عزائم پر گامزن کر دیا۔ غرضیکہ جس رومی کی علمی، فکری، عملی عظمت کو تسلیم کر کے اقبال نے اسے اپنا پیر و مرشد رہنما تسلیم کیا مناسب لگتا ہے کہ اس عظیم بے مثال ہستی کے بارے میں کچھ مزید ذکر اذکار کیا جائے۔

مولانا روم نے ساتویں صدی کے تصوف کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ سلوک کی منازل طے کیں۔ مشہور مشائخ کی صحبتوں میں شریک ہوئے۔ اُن میں سے ظاہری و باطنی فیوض حاصل کیے اور آخر میں مسندِ ارشاد و تلقین کو مجتہدانہ زینت عطا کی۔ امامِ فن اور مرشد کلام کی صورت میں مریدوں کی تربیت کی اور مولویہ، جلالیہ صوفیانہ سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔

آپ کا نام محمد لقب جلال الدین اور مولانا روم خطاب تھا۔ والد کی طرف سے سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک جاتا تھا۔ والدہ کا سلسلہ مشہور صوفی ابراہیم بن ادھم سے ملتا تھا۔ والد کا نام محمد بہاء الدین تھا اور لقب سلطان العلما تھا۔ رومی کے والد بلخ کے بہت موثر عالم دین اور باکرامت شیخ طریقت اور عوام و امراء میں بے حد مقبول تھے۔ رومی کی پیدائش ۶۰۴ھ ہجری بلخ میں ہوئی۔ سید برہان الدین محقق نے جو اُن کے والد کے خاص ارادتمندوں میں تھے، رومی کی تعلیم و تربیت کی۔ ①

مولانا کے والد سلطان العلما کی عوام و امراء میں مقبولیت شاہِ خوارزم کو بہت کھٹکتی تھی۔ اُس نے قلعہ اور خزانے کی کنجیاں سلطان العلما کے پاس بھیجیں کہ اہالیان پر تو پہلے ہی آپ کی حکومت ہے اب میرے پاس صرف قلعہ اور خزانے کی کنجیاں رہ گئی ہیں یہ بھی قبول فرماویں۔ سلطان العلماء بادشاہ کا اشارہ سمجھ گئے اور مع اہلِ خانہ بلخ سے نیشاپور ہجرت کر گئے۔ ہجرت کی دوسری وجہ تاتاریوں کی بے رحمانہ خونریزی بھی تھی۔ نیشاپور میں رومی کی ملاقات شیخ فریدالدین عطار سے ہوئی۔ انھوں نے رومی کو اپنی کتاب اسرار نامہ عطا کی اور ضروری تربیت کی۔ والد کے ساتھ بغداد اور پھر حجاز حج کے لیے گئے۔ بالآخر سمرقند آئے اب اُن کی عمر ۱۸ برس تھی۔ وہاں ایک باوقار گھرانے کی دوشیزہ گوہر خاتون سے عقد ہو گیا۔ جن سے رومی کے دو بیٹے سلطان ولد اور علاؤالدین پیدا ہوئے۔ ۶۲۴ھ میں رومی کے والد قونیہ (ترکی) پہنچے جو انقرہ کے

---

① قاضی تلمذ حسین، مولانا روم – نام، نسب، وطن، ناشر بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور، ص ۱۱–۱۳۔

قریب ہے اور اس کو وطن بنا لیا۔ دو سال بعد وفات پا گئے۔ رومی ۱۵ برس والد کے سفر و حضر میں ساتھ رہے اور ظاہری و باطنی علوم کی تکمیل کرتے رہے۔ وہاں بادشاہ کے اتالیق میر بدر الدین نے مولانا روم کے درس دینے کے لیے مدرسہ مکتبۂ خداوندگار کے نام سے تعمیر کرایا اور ساتھ دارالاقامہ بھی تعمیر کروایا۔ ①

والد کی وفات کے بعد مولانا کو بادشاہ اور دیگر مخلصین کے اسرار و اتفاق سے ۲۴ برس کی عمر میں جانشین بنا دیا گیا۔ جہاں مولانا درس دیتے۔ دیگر مشاغل کے لیے قونیہ سے باہر بھی آتے جاتے رہتے۔ مولانا اپنے اتالیق خلیفہ سید برہان الدین محقق ترمذی کے بلانے پر ملاقات کے لیے گئے جنھوں نے کہا، کہ قال میں تم اپنے والد سے بڑھ گئے ہو۔ لیکن اُن کا ایک حال بھی تھا جب تک وہ حاصل نہ کرو گے والد کے مکمل وارث نہیں بن سکتے۔ رومی نے حضرت ترمذی محقق کے مرید ہو کر ان کی وفات تک ۹ سال تک فیوض باطنی حاصل کیے اور اس کے بعد قونیہ میں درس کا سلسلہ جاری رہا۔

رومی طلب علم کے لیے حلب و دمشق بھی گئے۔ شیخ اکبر ابن عربی اور دیگر بلند پایہ اصحابِ علم و فضل سے ملاقاتیں رہیں۔ مولانا اپنے عہد کے المشہور حنفی علماء میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں مروجہ علوم میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ علم کلام میں اس کی مہارت کی شہادت ان کی شہرہ آفاق مثنوی ہے۔ ② علوم و حقائق کے لحاظ سے آپ کی حیثیت امام اور مجتہد کی تھی۔ وہ کئی جگہوں پر وعظ و تذکیر کا کام انجام دیتے۔ فتویٰ نویسی آپ سے باضابطہ متعلق تھی۔ جس کا معاوضہ ایک دینار روزینہ مقرر تھا۔ اس کو حلال رزق بنانے کے لیے آپ فتاویٰ کے جواب میں بڑا اہتمام کرتے۔ آپ کی ہدایت کے مطابق فتویٰ آنے پر فوراً پیش کیا جاتا۔ اور خدام قلم و قرطاس ہر وقت تیار رکھتے۔ ۶۴۲ ہجری تک یہ مشاغل جاری رہے۔ آپ خالص عالمانہ طریقے سے سر پر کلاہ رکھ کر عمامہ ③ باندھتے اور کشادہ آستینوں کی عبا زیب تن کرتے۔ ہر عمل میں زہد و تقویٰ

---

① قاضی تلمذ حسین، مولانا روم، والد بہاء الدین، شہرت و مناقب، ترکِ وطن، بلخ تا نیشاپور ابتدائی تعلیم، ص ۳۲-۳۹۔

② قاضی تلمذ حسین، والد کے ہمراہ نیشاپور سے بغداد، حج کی سعادت، قونیہ میں آمد والد کا انتقال، جانشینی، ص ۳۰-۳۵۔

③ قاضی تلمذ حسین، مولانا روم، اور فتویٰ نویسی، ص ۲۱۰۔

وعظ و تلقین میں پر وقار عالمانہ شان سے اظہار کرتے۔

مرشد محقق ترمذی کی وفات کی بعد ۴، ۵ سال آپ پر بڑے گراں گذرے۔ ذہنی انتشار رہا۔ انہی دنوں شمس تبریزی قونیہ میں وارد ہوئے اور مولانا روم سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ شمس تبریزی جن کے والد کا نام علاؤ الدین تھا۔ مختلف شہروں کی سیاحت کرتے رہتے تھے۔ جہاں جاتے دروازہ بند کر کے مراقبہ میں مشغول رہتے۔ ایک بار دعا مانگی کے اے خدا کوئی بندۂ خاص ہوتا جو میری محبت کا متحمل ہو سکتا۔ اشارہ ہوا کہ روم چلے جاؤ۔ چنانچہ یہ قونیہ پہنچے وہاں رومی جو خود کسی صاحب علم، ظاہر و باطن کی قربت کی خواہش رکھتے تھے۔ ایک تالاب کے کنارے کتب رکھ کر مطالعہ میں مشغول تھے۔ شمس تبریز پاس گئے اور کتب کی طرف اشارہ کے پوچھا کہ ایں چیست؟ رومیؔ نے شمسؔ کی معمولی وضع قطع دیکھ کر کہا کہ ایں چیزے ہست کہ تو نمی دانی۔ شمسؔ نے ہاتھ بڑھا کر وہ کتب پانی میں پھینک دیں۔ اس پر رومیؔ نے ناراضگی کا اظہار کیا تو شمسؔ نے کتابیں پانی سے نکال کر رومی کو دیں جو بالکل خشک تھیں۔ رومیؔ نے حیرت سے پوچھا کہ ایں چیست؟ تو جواب ملا کہ ایں چیزے ہست کہ تو نمی دانی۔ رومی کو محسوس ہوا اس کا گوہر مقصود خود ہی اُس کے پاس آ گیا ہے۔ اس موقع پر شمسؔ نے رومیؔ سے دریافت کیا کہ علم و ریاضت کیا ہے؟ رومی نے جواب دیا کہ اتباعِ شریعت، شمس نے کہا کہ یہ تو سب جانتے ہیں۔ مولانا رومی نے پوچھا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ شمس نے وضاحت کی کہ علم کی معنی ہیں تمھیں منزل تک پہنچائے اور پھر حکیم سنائی کا شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم ہے کہ جو علم منزل تک نہ پہنچائے اُس سے جہالت بہتر ہے۔ یہ ایسا لمحہ تھا کہ گویا دلی رازدلی ہی شناسد، دونوں گرم جوشی سی بغل گیر ہوئے۔ مولانا روم کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ عالمانہ ثقات و جلال رخصت ہو گئے۔ شیخیت کا وقار بھی غائب اور ایک الگ ہی جوش و شوق کا غلبہ ہونے پر ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ یہ جذب و مستی کا دور تھا۔ مولانا رومی، شمس کو ساتھ لے آئے تو دونوں شیخ صلاح الدین زرکوب کے حجرے میں میں معتکف ہو گئے اور مہینوں عزلت نشیں رہے۔

شمس تبریزی کی صحبت نے رومی کی کایا پلٹ دی۔ علمی قال و قول سے تعلق منقطع ہو گیا۔ کتابیں گویا دریا برد ہو گئیں۔ درس و تدریس وعظ و تلقین و تذکیر ترک ہوئے۔ عالمانہ لباس تیاگ دیا۔ مولویانہ ثقاہت و تفاخر کے ساتھ سجادہ نشینی کا بوجھ بھی رخصت ہوا۔ اور مریدوں کو

تلقین و تربیت بھی بے اتفاقی کی نذر رہوئی۔ اس کے برعکس احوال و وجد کی منزل شروع ہوئی۔ سماع اور قوالی سے رغبت پیدا ہو گئی اور اس قدر انہماک ہوا کہ لوگ انگشت نمائی کرنے لگے۔ ہاتھوں کو فضا میں لہرانا، چرخ دینا، چکر کھانا، پائے کوبی اور رقص معمول ہو گئے۔ سماع نے مولانا کے خاص سلوک کی حیثیت اختیار کر لی۔ شاعری مولانا کی فطرت تھی۔ لیکن یہ جوہر عالمانہ شکوہ و سجادہ نشینی کے جاہ و جلال کے نیچے دبا ہوا تھا۔ شوق و مستی نے اس دباؤ کو اکھاڑ پھینکا تو یہ فطری جوہر غزلوں، رباعیوں اور عالمی شہرت کی مثنوی میں درخشاں و تاباں نمایاں ہو گیا۔ گویا شمس تبریز کی صحبت کے زیر اثر مولانا کی زندگی میں صوفیانہ وضع کا موڑ آ گیا۔ زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ تصوف کے نئے افق ابھر کر سامنے آ گئے۔ تصورات عقاید و خیالات میں تغیر آ گیا اور نئی منزل دکھنے لگیں[۱] اور مولانا پکار اٹھے:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

مولانا اتنی عقیدت کے باوجود شمس تبریز کے باقاعدہ مرید نہیں ہوئے۔ نہ ہی شمس تبریز نے انھیں ہدایت رہنمائی کا محتاج سمجھا۔ بلکہ اُن کے روحانی مرتبے کی عظمت و جلالت کا بار بار اعتراف کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی صحبتیں بلند عروج کے لیے مشترک اقدام تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے فیض حاصل کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی تکمیل کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ تاہم شمس تبریز کی غیر موجودگی میں رومی کی بے چینی اور جستجو سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ رومی، شمس کی صحبت کو زیادہ ضروری جانتے تھے۔ شمس تبریز کوئی معروف روحانی عظمت کی شہرت نہ رکھتے تھے۔ نہ کسی معروف خاندان اور سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کے پیروکار اُن کے مولانا کے اس قدر قریب ہونے کے باعث شمس کے دشمن بن گئے اور اُن سے گستاخانہ رویہ سے پیش آنے لگے اس لیے ایک دن وہ خفیہ طور پر قونیہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس کا مولانا کو اتنا صدمہ ہوا کہ انھوں نے خواص و عوام سے بے تعلقی اختیار کر لی۔ مولانا کی گوشہ گیری اور بے تعلقی برابر قائم رہی کہ دمشق سے شمس تبریز کا خط آ گیا۔ جس کے

۱۔ قاضی تلمذ حسین، سید شمس تبریز سے ملاقات، ل سلوک، شعر گوئی کی ابتدا، ترک درس: تدریس، سماع سے رغبت، ص ۸۵-۹۲۔

بعد مولانا کی حالت سدھرنے لگی اور اپنے پیروکاروں پر پھر سے شفقت کرنے لگے۔ مولانا نے اپنے فرزند سلطان ولد کو شمس کے واپس لانے کے لیے بھیجا جن کے قونیہ دوبارہ آنے پر مولانا بے حد خوش ہوئے اور پھر سماع کی مجالس زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ مولانا نے اپنی بیٹی کیمیا خاتون سے شمس تبریز کا عقد کر دیا اور وہ وہیں رہائش پذیر ہو گئے۔ مگر یہ قیام بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ حلقہ بگوشانِ رومی کی رنجشیں دوبارہ اُبھر آئیں مفسدوں نے حالات مزید بگاڑ دیے۔ بیوی کیمیا خاتون بھی اس دوران چل بسی۔ شمس کی پاؤں کی بیڑی کٹ جانے سے اس کا قونیہ کا ہمیشہ کے لیے چھوڑنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ ایک دن وہ بغیر کسی کو بتائے قونیہ سے رخصت ہو گئے۔ مولانا کو خبر ہوئی تو حالت غیر ہو گئی۔ شمس کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر لاحاصل۔ اس بار مولانا نے گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ تاہم عزادار کا لباس مستقل زیب تن رکھا۔ بے چینی و بے تابی کم نہ ہوتی تھی۔ جذبات فراقی غزلوں اور رباعیوں کی صورت میں اُمڈ آتے تھے اور کئی کئی دن سماع و مستی میں گزر جاتے۔

شمس تبریز کے گئے ہوئے تھوڑے عرصے بعد سنا کہ وہ دمشق میں ہیں۔ مولانا نے فوراً خود دمشق جا کر تلاش شروع کی۔ مگر ناکام رہے۔ مگر یہ تاثر بیدار ہو گیا کہ خود میری ذات کے ذرات میں اُسی آفتاب کی ایک چمک ہے۔ میرے ساغر میں اُسی مینا کا مشروب ہے۔ میری جوئے آب میں اُسی دریا کا پانی ہے۔ اہل قونیہ جو مولانا کی ذات سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ اُن کی اجتماعی درخواست پر مولانا واپس قونیہ آ گئے۔ مگر اس تصور کے ساتھ کہ خود میں شمس ہوں اور یہ ساری جستجو اور تلاش شمس کی نہیں خود اپنی تھی۔ اس کیفیت کا جب انھیں یقین ہو گیا کہ شمس دنیا سے رشتہ توڑ چکے ہیں تو ایک نہایت دلدوز مرثیہ لکھ ڈالا۔[1]

اب مولانا ہمہ وقت شیخ صلاح الدین زرکوب کی طرف متوجہ ہو گئے اور باقی سب سے التفات ترک کر دیا۔ لوگوں کے لیے مولانا کا یہ انداز بھی ناقابل برداشت تھا کہ مولانا سب سے منہ موڑ کر ایک مقامی کم علم آدمی سے ناطہ جوڑ لیں۔ چنانچہ اس بناء پر صلاح الدین زرکوب کے خلاف برہمی اور شورش بڑھ گئی۔ لوگ محسوس کر رہے تھے کہ نورِ باطن نے ان کا ساتھ چھوڑ

---

① قاضی تلمذ حسین، اہل قونیہ کی بدگمانی، شمس و غائب ہونا، جدائی میں مولانا کی بیقراری، دوبارہ آمد، اہل قونیہ کی بدستور بدگمانی، شمس کا دوبارہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جانا، ص ۹۰-۱۲۰۔

دیا ہے۔ اتفاق سے لوگوں کے کھیت و باغ خشک ہونے لگے تو قحط کی سی حالت پیدا ہو گئی۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ وبال مولانا کی ناراضی کی وجہ سے ہے اور مولانا کے حضور صدق دل سے نادم ہو کر عذر خواہی کی۔ جس کی پذیرائی کے بعد یہ شورش ہمیشہ کے لیے دب گئی اور مولانا نے رشد و ہدایت کا فرض سنبھال لیا اور آخری دم تک مشغول رہے۔ ①

۶۵۷ ہجری میں زرکوب کے انتقال کے بعد مولانا نے شیخ حسام الدین جن کی فرمائش پر انھوں نے مثنوی لکھی تھی ۔ اپنا رفیق چن کر نائب اور خلیفہ کا اعزاز دیا۔ جسے لوگوں نے بے چون و چرا اس قبول کر لیا۔ مولانا کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت اور سماع میں صرف ہونے لگا۔ انھوں نے باقاعدہ منبر پر وعظ و تذکیر کرنا تو ختم کر دیا لیکن مجلسی صحبتوں میں معتقدین سے نصائح و مواعظ کو جاری رکھا۔ آخر کار روانگی کا وقت قریب آ گیا۔ ② خلاف معمول ضعف اور اضمحلال طاری رہنے لگا مشہور اطبا کے علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا۔ امراء علماء، شیوخ معتقدین مسلسل عیادت کو آ رہے تھے اور حالت دیکھ کر بے حد مغموم ہو کر جاتے۔ ایک دوست مزاج پرسی کے لیے آئے اور شفا کی دعا کی۔ مولانا نے کہا کہ شفا تمھیں مبارک ہو اب تو محبت اور محبوب میں بال برابر فرق رہ گیا ہے۔ تم نہیں چاہتے کہ وہ بھی ہٹ جائے۔ آخر ۶۷۲ ہجری ۵ رجمادی الاول مولانا کی صورت میں ارضی آفتاب اپنے سوگواروں کو روتا چیختا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جہانِ فانی سے غروب ہو گیا۔ صبح کو جنازہ باہر لایا گیا تو ہر مذہب و ملت کے لوگوں کا سیلاب روتا، آہ و زاری کرتا جنازے کے ساتھ رواں تھا۔ جنازہ نقاروں، نفیریوں کے ساتھ قبرستان جا رہا تھا۔ اخوش الحان قاری قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ خوش گلو موذن تکبیر کا ورد کر رہے تھے۔ کئی جوڑیاں سماع کرنے والوں کی گاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ لوگوں کی کثرت اور دھکم پیل سے چھ مرتبہ تابوت ٹوٹا اور مزار تک پہنچتے رات ہو گئی۔ شعراء نے دردناک مرثیے لکھے اور خوب سوگ منایا گیا۔ مولانا اپنے والد سلطان العلما کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔ اس تناظر میں مولانا سے لوگوں کے دل میں بے پناہ محبت و عقیدت بخوبی عیاں ہوتی ہے۔ ③

---

① ایضاً، شیخ صلاح الدین زرکوب سے التفات، ص ۱۳۶۔

② ایضاً، زرکوب کے بعد حسام الدین چلپی کو منظور نظر بنا کر اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، ص ۱۳۵۔

③ قاضی تلمذ حسین، مولانا کی وفات، تجہیز و تکفین، عدیم المثال جنازہ، ص ۱۵۵-۱۵۶۔

مولانا مذہب و ملل کے اختلاف کو محض رستوں کا اختلاف مانتے تھے۔ مگر اہلِ ظاہر کی نظر اس قدر وسیع نہ تھی۔ جو مولانا کے نظریئے سے اتفاق کرتے۔

مولانا دف، رباب وغیرہ کو رقص و وجود کے ساتھ سماع اور قوالی کا حصہ سمجھتے تھے اور انکار کو ناشکری جانتے تھے۔ مگر علماء مولانا کے اس عمل کو خلاف شریعت جانتے تھے۔ ①

آپ مریدوں اور معتقدین کا خلوص سے سجدہ کرنا روا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ تشکر احسان مندی کے اظہار کا تھا اور سجدہ حقیقت میں خدا کو ہوتا تھا۔

موت کی صورت میں روح کی جسم سے رہائی اور محبوب سے وصال کی خوشی منانے کے لیے جنازے کے جلوس کے ساتھ باجے، تاشے اور گانے کو مستحسن کہتے تھے۔ لیکن علماء اس کو بدعت شنیعہ قرار دیتے تھے۔ بہر کیف مولانا کی محبت و مقبولیت لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ قائم رہی۔

مولانا کا باطنی سلسلہ اُن کے بڑے بیٹے سلطان ولد سے چلا جو اُن کے منتخب پہلے خلیفہ حسام الدین کے دور سے شروع ہوا۔ ان کے واسطے سے مولویہ یا جلالیہ شیخیت اور سجادہ نشینی آج تک آپ کی نسل میں قائم ہے آپ کے مزار کی تولیت اگرچہ ترکی حکومت کے ہاتھ میں ہے جس پر سرکاری عملہ متعین ہے تاہم مشیخیت مولانا کے خاندان میں باقی ہے۔ دوسرے مزارات اور مقابر کی طرح مولانا کی تربت بھی مرجع خلائق ہے اور زیارت کے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔

مولانا کی تصانیف میں ایک ضخیم دیوان ۵۰۰۰۰ پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ایک مجموعہ رباعیات، اقوال کا مجموعہ، فیہ مافیہ اور ایک خطوط کا مجموعہ ملفوظات ہیں۔ مگر سب سے اہم عالمگیر شہرت کی حاصل تصنیف جس نے مولانا کو زندہ جاوید بنا دیا۔ مثنوی معنوی ہے۔ جو ادبی اہمیت کے علاوہ شریعت، طریقت اور آداب و اخلاق کا مخزن ہے اور ان کے عقاید، افکار و مشاہدات کا قابلِ اعتماد آئینہ ہے۔ یہ ہر طبقے میں مقبول ہے۔ وعظ و تذکیر کی مجالس میں حرارت ایمان پیدا کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ سلسلہ مولویہ کا گویا یہ الہامی صحیفہ ہے۔ چنانچہ مثنوی خوانی نہ صرف رواج و شعار بن گیا ہے بلکہ مثنوی خوانی ایک فن کی صورت اختیار کر گئی ہے جو ہند و پاک میں بھی دیکھی جاتی ہے۔

---

① ایضاً، باب سماع، ص ۲۳۶۔

اب مولانا کی فنی خوبیوں پر اجمالاً نظر ڈالتے ہیں۔ مولانا کی تعلیم و تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں علوم ظاہری اور معارف باطنی ہر دو موجود تھے۔ وہ دونوں سے فیض یاب ہوئے وہ اپنے عہد کے ممتاز عالم اور کثرت سے ریاضت گزار صوفی تھے۔ شمس تبریز کی صحبت نے احوال کو کشف و وجد کی اصلیت سے آشنا کیا۔ قال سے زیادہ حال کو اہمیت دیتے جس سے زہد و درویشی میں جذب و شوق کی چاشنی پیدا ہوئی۔ عالمانہ عز و تفاخر نے فقر و استغنا کے لیے جگہ خالی کی۔ لفظوں سے زیادہ معانی پر توجہ ہوگئی اور پوست کی بجائے مغز پر توجہ دینے لگے۔ شاعرانہ جوہر جو ان کی فطرت میں مخفی تھا مثنوی میں پوری تابانی سے روشن ہوا۔ مثنوی ایک طرف مروجہ علوم میں مولانا کی مہارت کی شہادت ہے۔ دوسری طرف خانقاہی معارف و مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس میں اپنے زمانے کے عام مزاج کی طرف اشاروں کے علاوہ وقت کی تہذیب و مدنیت کے بارے میں بہت کارآمد و دلکش معلومات ہیں۔

شاعری کے اعتبار سے مثنوی قدرتِ کلام کا اعلیٰ و دلپذیر مرقع ہے جس میں تصنع اور معائبِ سخن کو چھپانے کی کوشش نہیں بلکہ نسیمِ بہار کی آمد کی طرح گلستانِ خیالات میں سرور انگیز روانی ہے۔ کہیں کہیں کلام میں ابہام دقتِ فہم ہوسکتا ہے تاہم اُن کے بے تکلف اندازِ بیاں، نظر کی گہرائی و شدتِ احساس سے اُن کا کلام اتنی بلندی پر نظر آتا ہے، جہاں اساتذہ کا کلام بھی عام سا لگتا ہے۔ ان کے مصرعے اور اشعار مثالیں و کہاوتیں بن گئے ہیں۔ چنانچہ مجموعی حیثیت سے دنیائے ادب میں شاہ نامہ، فردوسی، گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ کی بعد فارسی میں چوتھی موثر ترین تصنیف مولانا کی مثنوی ہے اور یہ حد درجہ مسرت کی بات ہے کہ ان چار لازوال کتب میں پانچویں تصنیف علامہ اقبال کا جاوید نامہ قرار دی گئی ہے جو مطالب، معانی، مقاصد اور فنی اوصاف میں کئی اربابِ علم و ادب کے نزدیک ان سب سے ارفع ہے۔ بہرکیف مثنوی کو فارسی میں قرآن کا درجہ دیا گیا ہے۔ مولانا جامی نے کہا ہے:[1]

مثنوی و مولوی و معنوی
ہست قرآن در زبانِ پہلوی

اگرچہ بعض معترض حضرات کے نزدیک مثنوی میں بعض تمثیلات و حکایات قرآنِ حکیم

---

[1] ڈاکٹر محمد ریاض، جاوید نامہ، تحقیق و توضیح، اقبال اکیڈمی، ص ۹۔

کے تقدس کو مجروح کرتی ہیں میرے خیال میں یہ غلط تاثر ہے۔ بعض آیات کی تاویل مولویانہ اور فلسفیانہ ہونے کے باعث تو علماء کو منظور نہیں لیکن اس سے قرآن حکیم کا تقدس بالکل مجروح نہیں ہوا۔ معانی و مفہوم میں وسعت اور عقائد میں صفائی ہوئی ہے پہلے دفتر میں مسئلہ تقدیر اس کا ثبوت ہے۔ مگر یہ سوچنا چاہیے کہ مثنوی لکھتے ہوئے مولانا کے سامنے اپنے زمانے کے لوگوں کا مذاق اور مزاج تھا۔ جس کے لیے کبھی کبھی ویسا ہی انداز موثر تھا۔ جو مولانا نے اختیار کیا۔ غرضیکہ متنوع و مضامین و موضوعات، قصص و حکایات کی فراوانی کا بیان ظاہر و باطن کے بارے میں اسرار و لطائف اور قادر الکلامی نے مثنوی رنگ برنگ پھولوں کا دلکش گلدستہ بنا دیا ہے۔ اور تعلیم و تاثیر کے اثرات کو قائم رکھا ہے۔

مثنوی کا اصل موضوع تصوف و سلوک ہے۔ کثرت موضوعات کی تفاصیل کے باوجود مثنوی کا یہ محور اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ یہ ایک طویل منظوم نامہ ہے جس کے چھ جزو ہیں۔ اور آٹھ سال میں تکمیل کو پہنچا۔ مثنوی کا طرز استدلال عقل سے زیادہ احساس کو متاثر کرتا ہے اور دماغ سے زیادہ دل کو۔ مولانا دقیق سے دقیق مسائل کو دلچسپ تفصیلات سے اس طرح واضح کر دیتے ہیں کہ ان میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔ اور وہ روز مرہ کا تجربہ بن جاتے ہیں۔ مولانا کے اصحاب اور مخلصین جن کا انھوں نے تفکر و اثر قبول کیا ہے وہ ہیں حکیم سنائی کا الٰہی نامہ و معصیت نامہ، شیخ عطار کی منطق الطیر اور اپنے مرید خاص شیخ حسام الدین کی درخواست، جس پر انھوں نے اس انداز میں مثنوی شروع کی۔ ان کے علاوہ مولانا نے اپنے استاد مکرم سید برہان الدین محقق ترمذی اور اپنے والد گرامی سلطان العلما کے رسالے معارف بہار کو بھی مثنوی کے ماخذوں میں شمار کیا ہے۔ علاوہ شمس تبریز کے بہت سے مقالات، افعال اور قصص کو بھی اپنے معارف و تاثرات کا ماخذ قرار دیا ہے۔ جن سے مولانا کا تعلق زندگی کا ایک تاریخی موڑ ہے جن کے روپوش ہونے کے بعد مولانا کا کہنا تھا کہ شمس کے کمالات میرے کمالات ہیں اور شمس تبریز میں خود ہوں۔

قیام دمشق کے دوران مولانا کی شیخ اکبر ابن عربی سے کافی صحبتیں رہیں ہیں یہ خیال بے جا نہیں کہ مثنوی میں ابن عربی کے فکر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ کچھ اور

حقیقتیں بھی ہیں۔ جنھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ واقع یہی ہے کہ مولانا کا باطنی سلسلہ ابن عربی سے الگ ہے اور ترجیحیں بھی جدا جدا ہیں۔ کچھ معاصرانہ چشمک بھی وجہ ہو سکتی ہے مولانا کا اپنا انداز یہ ہے کہ حکیم سنائی، شیخ فرید الدین عطار اور ان کی مثنویوں کی تعریف و توصیف اپنے اصحاب اور مخلصین کی مجالس میں کرتے تھے اور مثنوی میں ان بزرگوں اور کتابوں کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا۔ لیکن ابن عربی یا اس کی کسی کتاب کا ذکر مثنوی میں نہیں کیا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا شیخ اکبر ابن عربی سے متاثر ہوں بھی تو ان کی خصوصی فکر سے نہیں۔ ابن عربی کے تاثرات میں بعض کے نزدیک یہ امر وضاحت طلب ہے کہ مولانا ابن عربی کے تصور وحدت الوجود کے حامی ہیں۔

ابن عربی مسلم صوفیا میں پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے وحدت الوجود کو ایک واقعیت کی صورت میں پیش کیا اور روحانی و مادی کائنات کی اس خیال سے توجیہ کی کہ مولانا کے اشعار کا خاصہ حصہ توحیدی اثرات سے تعلق رکھتا ہے اور غالباً اشعار کی بناء پر مولانا کو وجودی وحدت کے قائلین میں شمار کر لیا گیا ہے۔ مثنوی کے شارحین نے بالعموم مثنوی کی شرح ابن عربی کے وحدت الوجود کے زیر اثر کر ڈالی ہے۔ اور مولانا کی مثنوی کو توضیحات و تاویلات سے وحدت الوجود کی معتقد بنا دیا ہے۔ بلاشبہ مثنوی میں ایسے اشعار کافی تعداد میں ہیں جن سے توحید وجودی کا مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اصل تعلق حال و قال وجذب و استغراق سے ہے نہ کہ ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود سے۔ ان کی تالیف مناقب العارفین جس میں مولانا کے بہت سے ملفوظات ہیں۔ اس میں مولانا کا کوئی بیان نہیں جو اُن کے توحید وجودی کے عقیدے کو ظاہر کرتا ہو۔ مولانا کی تصنیف فیہ ما فیہ میں بھی اس خیال کا کوئی اظہار نہیں۔ اس لیے صریح رائے کے اظہار کے بغیر محض انفرادی تجربات و مشاہدات سے محسوس ہونے والی وجودی وحدت کو مولانا کا صوفیانہ مسلک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ مولانا اپنے کلام میں ارادتاً ابن عربی کی اصطلاحات سے بچتے تھے تاکہ توحید وجودی کے متاثرین میں ان کا شمار نہ ہو اور وہ ابن عربی کی طرح کائنات کی ہر شے کو خدا تعالیٰ کی ذات کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ عناصر کائنات کو بحر حیات یعنی اللہ تعالیٰ کی لامحدود ہستی کی سطح پر بلبلے، جھاگ، لہریں سمجھتے ہیں

جو بنتے، بگڑتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا خیال غالبؔ کے شعر سے بھی ظاہر ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں؟

جب کہ ابن عربی کے نزدیک کل شی هالك الا وجهه یعنی ہر فنا ہو جانے والی شے اصل شے سے مل جاتی ہے۔ گویا فنا ہونے والی شے اپنی ہستی کو کھو کر اصل ہستی سے مل جاتی ہے کیونکہ وہ باری تعالیٰ کا ہی حصہ ہے۔

مثنوی میں قرآنی آیات واحادیث کے بھی کافی حوالہ جات پائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ تقریباً ایک تہائی حصہ حکایات، قصص اور امثال پر مبنی ہے۔ جن میں کافی تعداد دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے۔ مثلاً مقالاتِ شمس تبریز، خواجہ عطار، امام غزالی اور انوری کے خیالات اور کلیلہ دمنہ جیسی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا مطلب مقصد صرف دلچسپی بڑھانا نہیں بلکہ حقائق ومعرفت، ارشاد، تلقین وہدایت ہے جو مثنوی کا اصل مقصد ہے۔

رومی مثنوی میں صوفیانہ اسلام کا تصور پیش کرتے ہیں جس میں نہ متکلمانہ عقلیت، نہ محققانہ ظاہریت ہے بلکہ فقیہانہ شدت و فلسفیانہ آزادیِ خیال سے الگ گہری جذباتیت، رواداری، تحمل، حلیمی اور والہانہ ایمان و ایقان، ارادت، خوش اعتقادی کی آمیزش کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مولانا کا اسلام تنگ نظری رسوم و قیود کی بے جا پابندی سے دور ہے۔ اصل اہمیت مغز و معنی کو حاصل ہے ظاہری پوست، وعظمیت وعقلیت پرستی کی اس میں گنجائش نہیں۔

اب موضوعِ مضمون کے لحاظ سے اقبال کے مولانا روم کے ساتھ گہری وابستگی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو آٹھ سو برس پہلے جہانِ فانی سے کوچ فرما چکے ہیں۔ اقبال آغازِ شاعری سے رومی کے پرستار نہ تھے۔ اگرچہ اُن کے تمام اردو کلام میں ۲۳ بار رومی کا نام آتا ہے اور بانگِ درا میں جو ان کی شاعری کی ابتدائی کتاب ہے صرف ایک شعر ہے جس میں رومی کا ذکر ہے:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا آباداں کنند
می نہ دانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند ①

① کلیاتِ اقبال، اُردو، ص ۲۶۳۔

اس کے برعکس فارسی شاعری میں رومی کا نام ۶ ۷ جگہ آیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اقبال نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے دوران مفکرین اسلام کا وسیع مطالعہ کیا۔ جس کی نتیجے میں رومی نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا اور رومی رفتہ رفتہ اقبال کے مرشد بن گئے اور اقبال مرید ہندی۔

اقبال کی اردو شاعری میں رومی کا تذکرہ جس انداز میں ملتا ہے اُس میں رومی قافلۂ عشق کا سالار ہے۔ رومی بننے کے لیے آہِ سحر گاہی ضروری ہے اقبال مزید کہتے ہیں۔ آج دنیا کے لیے رومی ناگزیر ہے۔ اتباع رسول ﷺ رومی سے سیکھو۔ میں نے سوز و ساز اور تڑپ رومی سے حاصل کی ہے۔ میری فکر رومی کے افکار کی خوشہ چین ہے۔ رومی عشق، جگر کاوی اور عمل کا بہتا دریا ہے۔ گذشتہ زمانے میں رومی تھا اور میں آج کے دور میں ہوں۔ میں نے سب کچھ رومی سے حاصل کیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے عرفان اور سوزِ رومی کو فلسفۂ پیچ و تاب رازی پر ترجیح دی اور پوری طرح رومی کے حلقۂ عقیدت میں آگیا اور یوں اعتراف کیا:

ئے مہرہ باقی ئے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی ①

گویا اقبال نے حکیم فقیہہ کے مقابلے میں کلیم کو اعلیٰ مقام دیا ہے:

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف ②

حکیم عقل کا نمائندہ ہے جو تخمین وظن کے اندیشے میں مبتلا رہتا ہے۔ اور کلیم عشق کی مدد سے مسائلِ حیات حل کر دیتا ہے۔ رومی کو اقبال اعلیٰ روایات کا امین جانتا ہے۔ اگر آج مسلمان سحرِ فرنگ میں گرفتار ہو گئے ہیں اور اپنی درخشندہ روایات بھول چکے ہیں۔ اس غلامی کا علاج اقبال کے نزدیک رومی ہے:

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں ③

---

① کلیاتِ اقبال، اُردو، اقبال نے رازی پر رومی کو ترجیح دی۔ رازی جبر کا حامی تھا، رومی قدر کا، ص ۳۶۳۔

② ایضاً، ص ۳۳۱۔

③ ایضاً، ص ۳۱۹۔

ہمیں فرنگی عقل کے بجائے رومی کی دانش نورانی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ جو علوم کے حصول کی تلقین کرنے کے ساتھ محبت اور اخلاص کے تابع رکھتی ہے۔ کیونکہ فرنگی دانش طمع، استحصال، تباہی، استعماری ظلم اور غیر اخلاقی ہتھکنڈوں کی حامل ہے۔ اگر مسلمانوں میں رومی جیسا رہنما رونما ہو جائے تو ان کی کھوئی ہوئی عظمت پھر حاصل ہو سکتی ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی ①

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ رومی کو اپنا مرشد بنانے میں رومی نے خود اقبال کو منتخب کیا تھا۔ تفصیل اس طرح ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی شاعری کا آخری دور شروع ہو گیا۔ یورپ کی تعلیمی اور صنعتی ترقی سے اقبال ذہنی طور پر بہت متاثر تھے۔ اس کے مقابل اُس کے ہم وطن شکست خوردہ، مایوس، مفلس، تقدیر اور قسمت کو ذلت و زوال کا سبب ٹھہرا رہے تھے۔ مگر اقبال کے نزدیک یہ حالت اُن کی تقدیر اور تقلید پرستی کے سبب سے تھی۔ جو علوم جدید سے لاتعلق کٹھ ملائیت اور وحدت الوجود کے علمبردار صوفیا کی پھیلائی ہوئی اور پیدا کردہ بے عملی کا نتیجہ تھی۔ اس انحطاطی اور مایوس ذہنی حالت سے نکالنا ہی مسلمانوں کا علاج تھا اور یہ فریضہ اقبال نے بطور حکیم الامت بڑی کامیابی سے سرانجام دیا۔ لوگوں کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے، اُن میں خود اعتمادی اور کھوئی ہوئی عظمت کے حصول کے لیے نیا عزم و ولولہ پیدا کیا اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے انھیں خودی کا تصور دیا۔ چنانچہ وہ مثنوی روم کی طرح مثنوی لکھ کر عوام تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جو یکم اگست ۱۹۱۲ء کو خواجہ حسن نظامی کے اخبار توحید میں شائع ہوا۔ جو یوں ہے کہ اقبال نے خواب میں دیکھا کہ مولانا انھیں مثنوی لکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ اقبال نے جواباً کہا کہ مثنوی کا حق تو آپ بخوبی ادا کر گئے ہیں۔ رومی نے کہا وہ چاہتے ہیں کہ اقبال بھی مثنوی لکھے۔ اقبال نے جواباً عرض کیا کہ آپ خود تو خودی مٹانے کی بات کرتے ہیں جب کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ قائم رکھنے کی چیز ہے۔ مولانا نے کہا اُن کا مقصد بھی وہی ہے جو اقبال سمجھتے ہیں۔ اس خواب سے اقبال بیدار ہوئے تو ان کی زبان پر فارسی اشعار جاری تھے۔ چنانچہ خواب کے اس

---

① ایضاً، ص ۳۰۳۔

واقعے کو خواجہ حسن نظامی نے اسرارِ خودی کے عنوان سے شائع کر دیا اور ۱۹۱۴ء میں اقبال کی مثنوی بھی اسرارِ خودی کے نام سے شائع ہو کر عوام کے سامنے آ گئی۔

اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مولانا روم کو ہی اپنا مرشد کیوں بنایا؟ جس کے بارے میں اہلِ فکر و بصیرت کا جواب ہے کہ اس خواب کی تعبیر کے لحاظ سے خود مولانا نے اقبال کو اپنے محبوب مرید کے طور پر منتخب کیا اور سب نے دیکھا کہ شاعرانہ زندگی کے اختتام تک اقبال مولانا روم کے ساتھ اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی شاگرد اپنے مرشد کے ساتھ طالبعلمانہ چلتا ہے۔ بالِ جبریل میں اقبال کی مشہور نظم "پیر و مرید" اور اس کی آفاقی شاعری کی تصنیف، جاوید نامہ جو اقبال کا رومی کی رہنمائی میں معراج نامہ یا سیرِ افلاک ہے اس کا بیّن ثبوت ہے۔

ویسے بھی مولانا روم اور اقبال میں مشابہت کے واقعات لحاظ سے کئی پہلو ہیں۔ دونوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر قرآنی تعلیمات کی توضیح کی۔ انھوں نے اپنے علاقے کی زبان کی بجائے دوسری زبان میں شاعری کی۔ مولانا کے علاقے کی زبان ترکی تھی اور ہندوستان کے عام زبان اردو مگر دونوں نے فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ اگرچہ اقبال کی اردو شاعری بھی بڑی وسیع اور اہمیت کی حامل ہے۔ دونوں کی تخلیقات نے بے حد شہرت حاصل کی اور ان کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے گئے۔ دونوں کے کلام پر قرآن پاک کی تعلیمات کے گہرے اثرات ہیں۔ دونوں نے اپنی بعد آنے والی نسلوں کو فکری طور پر بے حد متاثر کیا۔ دونوں اپنے زمانے کے سائنسی اور فلسفیانہ علوم سے آگاہ تھے اور انھیں کلام میں مقصد واضح کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دونوں کے افکار کا منبع قرآن حکیم ہے۔ بقول اقبال رومی عصرِ کہن کے فتنوں کا علاج تھے اور وہ خود دورِ حاضر کے مسائل اور فتنوں کا۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من (۱)

---

(۱) ایضاً، فارسی، ص ۳۔

اقبال نے مثنوی اسرار خودی کی ابتدا ہی رومی کے اشعار سے کی:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو است

یعنی رومی کو معاشرے کے لیے ایسے انسان کی تلاش تھی جو اعلیٰ اخلاق حسنہ اور کمالات کا مرقع ہو اور، بالفاظ اقبال کے مطابق اپنی خودی کی تکمیل کی منازل طے کر چکا ہو۔ رومی اور اقبال نے افراد کی تعمیر کی اہمیت پر اس لیے زور دیا ہے کہ افراد سے ہی قومیں بنتی اور سربلند ہوتی ہیں۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

مولانا روم حکیم سنائی و عطار کو اپنا پیش رو قرار دیتے ہیں اور اُن کی مدح میں کئی اشعار کہے ہیں۔ اقبال بھی اُن کے مقام کا قائل ہے تاہم اُن کے تصورِ افلاس و جسمانی نقاہت، ضعف پسندی سے اتفاق نہیں کرتے کہ ایسے افراد اور قوم کمزور و بے عمل بنانے والے عناصر ہیں۔ وہی قوم اپنے دشمنوں، مخالفین اور زمانے کے چیلنجوں سے عہدہ براہ ہو سکے گی۔ جس میں اخلاقی اوصاف کے ساتھ دنیاوی وسائل، مال و متاع و قوی جسم کے افراد ہوں گے۔ مادی وسائل نہ صرف دنیاوی حاجات، اصلاحی کاموں کے لیے کام آتے ہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اُن کی ضرورت ہوتی ہے اور صحت مند و جفاکش مضبوط انسان ہی کیا امن کیا جنگ، کمزور و ناتواں سے بہتر کارگردگی دکھا سکتے ہیں۔ البتہ اقبال نے ذاتی تعیش، امیرانہ ٹھاٹھ بھاٹھ کی بے حد مذمت کی ہے اور طبیعت میں فقر و استغنا کو اختیار کرنے کے لیے تاکید کی ہے۔ اُن کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری ①

① ایضاً، اُردو: ص ۳۳۴۔

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اُس نے فقیروں کا وارثِ پرویز①

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا②

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی③

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا④

اُس کی شدید خواہش ہے کہ ماضی کی طرح مسلمانوں کو پھر شان و شوکت حاصل ہو۔ اور وہ اس ضمن میں پرامید تھے۔

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نُطقِ اعرابی
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری

---

① ایضاً ص ۳۰۸۔
② ایضاً ص ۳۱۵۔
③ ایضاً ص ۳۲۷۔
④ ایضاً ص ۳۱۶۔

یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ①

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ افلاس اور ضعف و ناتوانی کوئی قابل قدر اشیاء نہیں۔ ہاں دولت و اقتدار کے ہوتے ہوئے فقر و استغنا اصل جوہر ہیں۔

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری②

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد③

غرضیکہ افلاس میں توکل ضعف و ناتوانی میں حُسن، ترکِ دنیا میں معرفت، بیکاری و بے عملی میں شانِ بے نیازی۔ یہ دراصل وحدت الوجود کے مضر تحائف ہیں۔ جن سے رومی اور اقبال مسلمانوں کو چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ اقبال اپنے مرشد رومی کی رہنمائی میں اپنی عظیم تصنیف جاوید نامہ میں سیرِ افلاک کو جاتا ہے اور ہر فلک پر مشاہیر سے الگ الگ ملاقات وسوال و جواب کرتا ہے۔ جو دراصل اہلِ زمین کی مشکلات و مسائل حل کرنے کے لیے ایک منظوم تمثیل اور حیرت انگیز مناظرے کا مرقع ہے گویا جاوید نامہ افلاکی سفرنامہ کی صورت میں محض ذہنی تعیش کے لیے نہیں لکھا گیا۔ بلکہ اپنی ملت پر گزرے ہوئے کٹھن حالات و مصائب سے دو چار ہونے کے بعد موجودہ پس ماندگی، شکستہ اور پژمردہ قوم میں جذبہ آزادی، حریت و حمیت پیدا کرنے اور ان کے لیے درخشاں مستقبل کی نوید کا حامل ایک پیغمبرانہ صحیفہ ہے۔ اقبال نے اپنے عزیز معتقد ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے خود کہا کہ اس تصنیف کے بعد میرے دل و دماغ نچڑ گئے ہیں۔④

---

① ایضاً، ص ۲۶۷۔
② ایضاً، ص ۳۳۴۔
③ ایضاً، ص ۳۶۳۔
④ ملفوظاتِ اقبال، ۱۹۷۷، اقبال اکیڈمی، لاہور، ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے گفتگو، ص ۱۳۶۔ جاوید نامہ، تحقیق و توضیح، ڈاکٹر محمد ریاض، ص ۹۔

اقبال نے رومی کے کلام کی تشریح و توضیح اس طرح کی ہے کہ رومی دورِ جدید کے رہنما کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ بقول استاذ الاساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ: "اقبال سے پہلے رومی کی نوعیت جزوی اور انفرادی تھی۔ یہ اقبال ہی تھے جن کے طفیل رومی کے افکار کی تشریح ہوئی۔ جس سے وہ حیاتِ اجتماعی اور ارتقاءِ انسانی کے ایک بڑے ترجمان اور محرمِ اسرار ثابت ہوئے۔" اقبال رومی کے کلام کی شرح کی طرف اس لیے متوجہ ہوئے کہ ان کے ہاں عصرِ حاضر کے مسائل کا حل ملتا ہے اور بڑی حد تک اقبال کے نظریات سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ بالِ جبریل کی نظم پیر و مرید میں رومی کے مرید کی طرح ان سے سوالات کر کے زندگی کی پیچیدگیوں کو حل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مکالمہ یوں ہے:

مرید ہندی:

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

جواب رومی:

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود (۱)

اقبال اور رومی دونوں کے ہاں دل کی بڑی اہمیت ہے۔ رومی بتاتے ہیں کہ خدا دل میں ہے۔ لہٰذا اُس کی تلاش دل میں کریں۔ اقبال خودی اور خدائی کو معنوی طور پر قریب لے آتے ہیں۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے (۲)

---

(۱) کلیاتِ اقبال، اردو ص ۴۳۶۔

(۲) ایضاً ص ۴۳۰۔

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے ترے لیے اب اصلاحِ کار کی راہ①

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے②

رومی کے نزدیک خودی تکبر، غرور، رعونت کے معنی رکھتی ہے جو مستحسن رویے نہیں۔۔۔ مگر اقبال نے خودی کو انسان کی سب سے بڑی متاع قرار دیا ہے۔ دراصل یہ فرق رومی اور اقبال کے مختلف زمانوں کی وجہ سے ہے۔ رومی کے زمانے میں اسلامی حکومت تھی۔ مگر اقبال کے دور میں ہندوستان غلام تھا۔ اقبال نے خودی کو ذات کی تکمیل کے معنی دے کر قوم کو بیداری اور حصولِ آزادی کے عمل کے طور پر استعمال کرنے پر مائل کیا۔ اقبال کہتا ہے کہ جن کی خودی خام ہو وہ ناکام رہتے ہیں۔ خودی پختہ ہو تو اس کی مرضی خدا کی رضا ہو جاتی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز③

منصور حلاج کے نعرۂ انا الحق کو رومی اور اقبال دونوں خودی کا مظہر قرار دیتے ہیں اور اُس کی سزا کو خونِ ناحق سمجھتے ہیں:

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند
بندۂ حق را بدار آویختند④

رومی و اقبال دونوں عشق کے پرستار ہیں۔ رومی خدا کے عشق میں فنا ہونے کے قائل ہونے کے باوجود بقا کے قائل ہیں اس کی مثال اس طرح دیتے ہیں کہ لوہا آگ میں پڑ کر آگ

---

① ایضاً، ص ۳۳۸۔
② ایضاً، ص ۳۴۷۔
③ ایضاً، ص ۳۸۹۔
④ کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۷۱۰۔

کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ مگر وہ لوہا ہی رہتا ہے اور اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ اس مثال میں اقبال کے تصورِ خودی کا عکس بھی موجود ہے۔ ①

اقبال قطرے کو دریا میں مل کر فنا ہونے کے برعکس صدف میں موتی کی حیثیت اختیار کرنے کو کہتے ہیں کہ سمندر میں ہوتے ہوئے اپنی انفرادیت، وجود و احساسِ بندگی کو زندہ رکھ کر خدا سے الگ اپنی ذات اور مقام قائم رکھے۔ بقول اقبال:

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں ②

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی ③

گویا مولانا کے نزدیک عشق فنا و ذات کی مانند ہے مگر اقبال کے ہاں عشق تعمیرِ ذات کا باعث ہے۔

رومی اور اقبال عشق کو انسانیت کی بیماریوں کا علاج اور طاقت، ہمت، عزم و استقامت کا ذریعہ جانتے ہیں۔

رومی کہتے ہیں:

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما ④

اور اقبال یوں گویا ہیں:

---

① مثنوی معنوی مولانا روم، دفتر دوم، ص ۱۳۱۔
② کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۳۳۹۔
③ کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۳۰۶
④ مثنوی، معنوی مولانا روم، دفتر اول، ص ۳۳۔

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما
اے کشتِ ما اے حاصلِ ما ①

عشق خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق ②

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نارِ حیات عشق ہے نورِ حیات ③

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام ④

رومی اور اقبال عقل و عشق کی آویزش میں اگرچہ عشق کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر پوری طرح عقل کو رد نہیں کرتے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ عقل کو اقبال جویائے راہ اور عشق کو دانائے راہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ عقل ایک حد تک رہنمائی کرتی ہے اس کے بعد ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جیسے واقعہ معراج میں جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر کہتا ہے:

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم ⑤

دونوں کے نزدیک عقل ایک حد تک کارآمد ہے:

---

① کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۲۲۵۔
② کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۴۰۳۔
③ ایضاً، ص ۳۷۸۔
④ ایضاً، ص ۳۷۷۔
⑤ ایضاً، ص ۳۲۱۔

خرد سے رہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغ رہگزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے؟①

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں②

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے③

مولانا کو مرشد بنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تقدیر کے مسئلہ پر اقبال کے ہم خیال ہیں۔ انھوں نے رومی کے مقابلے میں امام رازی کو اس لیے مسترد کر دیا کہ وہ جبر کے قائل تھے۔ جب کہ رومی قدر کے حامی تھے۔ اقبال مسلمانوں کو جدوجہد کی تعلیم دینا چاہتے تھے۔ جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ انھیں غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے مگر تقدیر کا مسئلہ ان کی راہ میں حائل تھا کہ جو تقدیر میں خدا نے لکھ دیا ہے وہی ہوتا ہے ہمارے کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رومی اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ تقدیر کے لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے بلکہ یہ کہ ہر کام کی جزاء اور تاثیر مقرر کر دی گئی ہے۔ اگر اچھا کام کرو گے تو اچھا نتیجہ ہوگا اور برا کرو گے تو برا ہوگا۔ یعنی لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کہ انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ کوشش کرے۔ چنانچہ اچھے اور برا کام کرنے کا نتیجہ مقرر کر دیا گیا۔④ اقبال افسوس سے تقدیر پرستوں کی سوچ کے

---

① ایضاً،ص ۳۷۷۔

② ایضاً،ص ۳۳۵۔

③ ایضاً،ص ۳۷۶۔

④ مولانا روم از شبلی نعمانی

بارے میں کہتے ہیں کہ:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ ①

بلکہ وہ شکوہ کرتا ہے:

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اقبال رومی سے سلطانی یا راہبی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں:

کاروبارِ خسروی یا راہبی
کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبیؐ؟ ②

تو رومی جواب میں کہتے ہیں:

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دینِ عیسیٰ غار کوہ

اس سے تقدیر کے جبر کی حد اور عمل کی قوت تغیر؛ تسخیر کے بارے میں بات واضح ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بااختیار بنا کر خود اپنے آپ پر پابندی عاید کر رکھی ہے کہ وہ انسان کے عمل میں مداخلت نہیں کرے گا جو اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوگا۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ نیکی، بدی، جبر و اختیار میں کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔

اقبال اور رومی دونوں نظریہ ارتقاء کے قائل ہیں۔ اقبال نے مولانا کے شعر اپنے خطبات میں نقل کیے ہیں کہ زندگی کا ظہور جمادات سے ہوا تھا۔ پھر نباتات کی شکل میں، پھر حیوان اور آخر میں انسان کے قالب میں داخل ہوئی؛ اقبال کے نزدیک نظریہ ارتقاء انسان کو مستقبل سنوارنے کی تعلیم و ترغیب دیتا ہے۔ اُس کی اپنی شاعری میں یہی اصول کارفرما نظر

① کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۶۸۷۔
② ایضاً، ص ۳۳۱۔

آتا ہے۔ اس ارتقا کو بعض ناسمجھ مخالفین تضاد کہتے ہیں۔ حالانکہ اقبال ہر لحہ تغیر اور حرکت کا علمبردار ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی ①

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی ②

اقبال اور رومی میں ایک اختلاف یہ ہے کہ مولانا تو باطنی مفہوم کے قائل ہیں۔ مگر اقبال باطنی مفہوم کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک وہی معنی درست ہیں جن کو الفاظ کے مطابق عام لوگ سمجھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے حافظ شیرازی کے کلام پر تنقید کی تھی کہ اس کا ظاہری مفہوم قوم کے لیے غیر مفید ہے۔ گویا باطنی مفہوم کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ حقیقت میں مذہب یا قوم کے دستور العمل میں باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل دستور العمل کو مسخ کر دیتا ہے۔ یہ ایک فنکارانہ یا منافقانہ طریقۂ تنسیخ ہے۔ یہ طریقہ وہی قومیں اختیار کرتی ہیں جن کی طبیعت میں گوسفندی ہو اور مردانگی عمل و جد وجہد کے اوصاف سے محروم ہو چکی ہوں۔ ③ اسی بنا پر اقبال نے اسرارِ خودی کے دیباچہ میں حافظ کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے اسے قوم کے لیے نہایت ضرر رساں قرار دیا۔ مگر جب اس کی حد درجہ مخالفت ہوئی تو مذمت کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ لوگوں کو اصلیت سے آگاہی ہو گئی ہے۔ اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر اپنے آخری دور میں وہ خود بھی کسی حد تک وحدت الوجود اور ابن عربی کے نظریات سے اتفاق کرنے لگ گئے۔ اس طرح حافظ کے کلام پر تنقید سے جو تلخی پیدا ہوئی تھی اسے رومی کی دوستی نے ختم کر دیا۔

---

① ایضاً، ص ۲۵۹۔

② ایضاً، ص ۳۱۷۔

③ اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۳۵-۳۶۔

رومی اور اقبال کے نظریات میں مماثلت کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس طرح سمیٹا ہے۔

۱- اقبال کے نظریۂ خودی کا تصور رومی کے ہاں ملتا ہے۔ عام صوفیاء نے فنا اور ترک پر زور دینا عین دین بنالیا ہے۔ مثنوی نے اس کو بقا میں بدل دیا ہے۔ رومی اور اقبال دونوں کے ہاں خودی کا استحکام لازم ہے۔

۲- عجمی تصوف نے ترک حاجات کو خدارسی کا ذریعہ قرار دیا تھا مگر رومی کے نزدیک حاجات منبعِ اثباتِ وجود اور ذریعۂ بہبود ہیں بشرطیکہ حاجات پست اور حیات کُش نہ ہوں۔ اقبال کے کلام میں جا بجا اس نظریے کی توثیق میں اشعار ملتے ہیں۔

۳- اقبال کا فکر، عقل، آرزو، جستجو کا نظریہ رومی کے افکار میں بھی ملتا ہے کہ انھی کی وجہ سے جذبوں کا تموج اور احساسات کی حرکت کبھی نہیں تھمتی۔ یعنی:

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل اُو در آرزو پوشیدہ است

۴- رومی اور اقبال دونوں وجود کے فنا کے بعد بقاء دوام کے تصور پر یقین رکھتے ہیں۔ فنا حقیقت ہے مگر مردِ مومن کے عمل میں رنگِ ثباتِ دوام ہے۔ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود سے دونوں کو اتفاق نہیں ہے۔

۵- دونوں کے یہاں عقل و عشق کا باہمی ساتھ زندگی کا تقاضا ہے۔ عقل و عشق اپنے اپنے مقام پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ عقل عشق کی اولین منظہر ہے جو ماورائی حد پر پہنچ کر عشق کے حق میں دستبردار ہو جاتی ہے۔

۶- دونوں جبر کے منکر ہیں اور تقدیر کی اس تعبیر کو رد کرتے ہیں جو انسان کی ذہنی و جسمانی ارتقا کی رفتار کو روکتی ہے۔

مندرجہ بالا معروضات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ علامہ رومی سے کس قدر متاثر ہیں۔ اگرچہ زمانوں کے فرق کی وجہ سے بعض امور پر اقبال کو رومی سے ایک حد تک اختلاف بھی ہے۔ جو قدرتی امر ہے تاہم عام طور پر وہ رومی کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ رومی اور اقبال دونوں نابغۂ عصر انسان ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عطا

کیے۔ اقبال کی محبت رومی سے خصوصاً اس سبب سے بھی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مروجہ علوم پر حاوی ہونے کے ساتھ اسلام کی عظمت سے ہمارے دلوں کو معمور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے موجودہ زمانے کے لیے ایسے رہنما کی موجودگی کی آرزو کی ہے جو رومی کی طرح نہ صرف اسلام اور علومِ جدیدہ سے آگاہ ہو بلکہ ہم نفسوں کے لیے اس کا دل محبت سے معمور ہو۔ جو فلسفۂ رازی کی پیچیدگیوں میں اُلجھانے کی بجائے قوم کے ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لے آئے۔ جو منزل کی طرف جاتی ہو جسے یوں بیان کیا:

شعر کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبال بحیثیت سیاستدان-تحریک پاکستان کا خضرِ راہ

علامہ اقبال علیہ الرحمت نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنی جان آفریں کے سپرد کی اور ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو ان کی وفات کے ایک سال گیارہ ماہ بعد سرزمین لاہور میں قائداعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت وہ قرارداد لاہور جسے قرارداد پاکستان بھی کہا جاتا ہے منظور ہوئی اور ۱۴اگست ۱۹۴۷ء کو اس قرارداد کی معنوی تعبیر پاکستان دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوگئی۔ اور یوں حضرت علامہ اقبال کی مسلم قوم کو اُس خواب کی تعبیر مل گئی۔ جو انھوں نے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کی شکل میں دیکھا تھا۔

اقبال کثیر الجہت جامع صفات اور نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ انھیں عظیم شاعر مشرق، بلند پایہ فلاسفر، ماہر تعلیم، حکیم الامت، ماہر علوم شرق و غرب، ترجمان حقیقت وغیرہ کے القاب سے پکارا جاتا رہا ہے۔ اور نیم دلانہ طور پر سیاستدان بھی کہا گیا ہے۔ مگر جہاں وہ نہایت عظیم شاعر فلاسفر و مفکر تسلیم کیے گئے۔ وہاں سیاستدان کے طور پر ایک ناکام سیاستدان تک کہہ دیا گیا۔[1] حالانکہ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے مال و دولت اکٹھا نہیں کیا۔ نہ جاہ و حشمت کے عہدوں کی خواہش کی۔ بلکہ اُن سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ آزاد زندگی کے لیے گورنمنٹ کی ملازمت ترک کردی۔ قومی مسائل کی فکر میں وکالت تہ کرکے رکھ دی۔ اور کسی

---

[1] ڈاکٹر رفیق زکریا، اقبال شاعر و سیاستدان، مزنگ روڈ لاہور، تحریر کیا ہے کہ اقبال ایک وکیل اور سیاستدان دونوں حیثیت میں ناکام تھے۔

پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں بھی ایک تماشہ کن کی حیثیت رہی۔ کسی جماعت کا ساتھ یا تائید نہ تھی ان کی تقریریں نہایت مدلل اور مثبت ہونے کے باوجود نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ جاتیں۔ معاشی طور پر انھیں بے حد نقصان ہوا۔ وکالت ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ اراکین اسمبلی کے منافقانہ رویہ سے آئندہ الیکشن سے دستبردار ہو گئے۔ (جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۵۰۵۔)

عالیجاہ کی عنایات کی تمنا نہ کی بلکہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یوں برملا کہا:

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

وہ اپنے فرزند جاوید اقبال سے کی گئی نصیحت پر زندگی بھر کاربند رہے۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر ①

اگرچہ انھوں نے اوائل عمری سے آخر تک شعر وفلسفہ کی دنیا پر حکمرانی کی۔ مگر بلاشک اُن کی سیاسی قیادت کا آغاز بھی ۲۰ صدی کے آغاز سے ہوگیا تھا۔ ۳۵ سال سے زائد عرصہ تک وہ ملّت کی ذہنی وفکری رہنمائی کرتے رہے۔ انھوں نے بے شمار سیاسی خدمات سرانجام دیں غیر منقسم ہندوستان میں جہاں بھی انھیں یاد کیا گیا۔ وہ پہنچے منظوم پیغام پہنچائے خطبات دیے مکتوبات تحریر کیے۔ اپنے مفکرانہ کلام سے سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کی، قوم کو تعلیم تجارت وصنعت وجدید علوم کے حصول کی طرف راغب کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اپنی بے لوث بے ریاہ طبع کے تحت غلط فہمیاں دُور ہونے پر قائداعظم سے تمام اختلافات تج کر انھیں لکھا کہ وہ لندن سے واپس آکر قوم کی ڈگمگائی کشتی کو دشمنوں کے گھیرے سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچائیں۔

۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر کے طور پر ۴ سال کے لیے منتخب ہوئے تو قومی مسائل میں بہتری کے لیے اپنے تمام معاشی اور گھریلو اُمور سے لاتعلق ہوگئے۔ بلکہ دن رات کی محنت سے اپنی صحت برباد کرلی۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں جب وہ صرف ۵۷ سال کے تھے جو کرپختگی کی عمر ہوتی ہے۔ متواتر چار سال تک دم واپسیں تک شدید بیمار رہے۔ اور اس دوران میں بھی قومی معاملات پر قائداعظم رفقاء سفر کو ضروری مشورے دیتے اور بیانات جاری کرتے رہے۔ اور آخرکار ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنی جان قوم پر نثار کردی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو بیش بہا خدمات جاری رکھتے۔ اپنی زیر غور قرآنی تفسیر اسلامی فقہ کی شرح جدید، تاریخ اسلامی اور کئی

---

① کلیات اقبال اردو، ص ۴۳۹،۳۸۳۔

بے مثال کتب سے اسلامی علوم کو مالا مال کر دیتے کون ہے جو اقبال کے جدا ہونے پر اس قیمتی علمی خزانے سے محروم ہو جانے پر دکھی نہ ہوا ہو۔ بخدا یہ سوچ کر دل سے درد بھری آہ نکل جاتی ہے۔

اگر چہ اقبال کی عملی سیاست پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء سمجھی جاتی ہے۔ جب انھوں نے سیاسی مسائل حل کرنے کے لیے بھرپور محنت کی اور اسمبلی میں شعر و ادب سے ہٹ کر بطور پارلیمنٹرین اُن کا قابلِ رشک روپ سامنے آیا۔ جس میں ان کی تقاریر زیرِ غور موضوع پر نہایت عالمانہ، مفکرانہ فلسفیانہ ادبی چاشنی سے مملوفطری ظرافت کی مسکراہٹوں سے مرصع، ضروری اعداد و شمار سے آراستہ، جوابی جملہ میں برجستگی سے معمور ہوتی تھیں۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے ہر متعلقہ شعبے میں بطور سیاستدان نہایت قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔

اقبال ۱۹۲۶ء میں عقیدت مندوں کے اصرار پر اپنے دوست عبدالعزیز مالواڈہ جو ارائیں برادری کی حمایت سے مستقل منتخب ہوتے آ رہے تھے۔ اقبال کے حق میں الیکشن سے دستبردار ہونے پر اقبال بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے تو انھوں نے آغاز میں اپنا منشور پیش کرتے ہوئے کہا کہ ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کے وقت اپنے ذاتی مفاد کو قوم پر قربان کر دے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے ذاتی مفاد کو قوم کے مفاد کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوں گا اور رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق عطا کرے کہ میں آپ کی کماحقہ خدمت کر سکوں میں اغراضِ ملی کے مقابلے میں ذاتی خواہشات کے فوقیت دینے کو موت سے بدتر خیال کرتا ہوں۔ (۱)

ممبری کے دوران میں انھوں نے تعلیم اور فنانس کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں:

۱۔ دیہات میں تعلیم اور صفائی کے بہتر انتظامات

۲۔ عورتوں کو طبی امداد کی فراہمی۔

۳۔ محاصل اور لگان میں کمی

۴۔ خاص طور پر چھوٹے کسانوں کو لگان کی معافی

---

(۱) نقوش، اقبال نمبر ۲، مضمون ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، علامہ اقبال کا انتخاب کونسل، ص ۶۹-۳۶۸۔

۵-محصول کی وصولی میں ناانصافی کا تدارک
۶-ہر شخص پر اس کی اہلیت کے مطابق ٹیکس اور ادائیگی کے لیے مناسب وقت دیا جانا۔
۷-فروغ تعلیم پر فکر انگیز تقاریر۔
۸-مفت ابتدائی جبری تعلیم کے نفاذ پر زور۔
۹-آبادی میں تعلیم کی شرح اور معیار میں بہتری کی ضرورت۔
۱۰- اداروں اور بلدیہ میں مسلم آبادی کے تناسب سے سیٹوں کا تعین۔
۱۱-حکومت پنجاب ضلع منٹگمری میں ساڑھے تین لاکھ اراضی فروخت کر رہی تھی جس کا فائدہ بڑے زمیندار اٹھا رہے تھے۔ لہٰذا زمین کا نصف حصہ چھوٹے زمینداروں کے لیے مخصوص کیا جائے۔
۱۲-انسداد شراب نوشی پر تجاویز
۱۳-سکھوں کو کرپان کے مقابلے میں مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی آزادی۔
۱۴-ٹیکس قانون میں ترمیم کر کے اسے انصاف کے اصولوں کے مطابق بنایا جائے۔
۱۵-یونانی اور مشرقی طب کی حوصلہ افزائی جو زیادہ آبادی کے موافق بھی ہے اور ارزاں بھی۔
۱۶-عدالتی سٹیمپوں اور آبکاری کی آمدنی میں اضافہ حکومت کے لیے باعث اطمینان نہیں ہونا چاہیے جس کا مطلب ہے کہ مقدمہ بازی اور شراب نوشی بڑھ رہی ہے۔
۱۷-صوبے کی حالت کی بہتری کے لیے ذرائع آمدنی میں اضافے کے لیے نئی قابل ادائیگی ٹیکس مدوں پر ٹیکس کا نفاذ۔
۱۸-انگلستان کی طرح ہمیں بھی اموات پر وراثت ٹیکس لگانا چاہیے تاکہ صحت، فلاحی اور اہمی روزگار جیسے شعبوں پر خرچ کیا جائے اور وارثان میں خود محنت کر کے کمانے کا جذبہ و شوق پیدا ہو۔
۱۹-بڑی اور کم تنخواہوں میں فرق کم کیا جائے۔
۲۰-مشینری ارزاں ترین مارکیٹوں سے خریدی جائے۔
۲۱-بزرگان دین کی توہین کا انسداد اور باہمی مذہبی رواداری کی حوصلہ افزائی۔
۲۲-صنعت کے لیے کارخانے اور جدید علوم کے لیے تعلیمی ادارے اور ریسرچ مراکز

قائم کر کے ترقی کو فروغ دیا جائے۔ ①

۲۳-مسلم آبادی میں تعلیمی ناانصافی اور ملازمتوں سے محرومی کا تدارک اور بہتر معاشی بنیاد کی حوصلہ افزائی وغیرہ وغیرہ۔

اس دور میں سر غلام حسین کی یونینسٹ پارٹی کا غلبہ اور اجارداری تھی۔ اور مسلم لیگ کی طرف سے اقبال صرف تنہا رکن تھے تاہم انھوں نے مسلم لیگ کے مفادات کے تحفظ کی بھرپور کوشش کی اور کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا۔ وہ یونینسٹ پارٹی کے سراسر خلاف تھے۔ جس نے شہری، دیہاتی، زمیندار اور غیر زمیندار کی بنیاد پر سوسائٹی کو تقسیم کر دیا تھا۔ جس سے مسلمانوں کو ہندوستان کی اجتماعی حیثیت اور سیاست میں بے حد نقصان پہنچ رہا تھا۔ مگر اقبال کی کوششوں سے مسلم لیگ کے اثر میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ اقبال اگر چاہتے تو بے حد و حساب فائدے کے لیے سر غلام حسین کی یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتے۔ مگر ان کا مطمع نظر اٹل تھا کہ:

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول ②

رکنیت کی مدت ختم ہونے پر اقبال کو دوبارہ ممبری الیکشن کی استدعا کی گئی مگر اسمبلیوں میں بے کار شور شرابے تضیع اوقات کی بنا پر اقبال نے صوبائی اور مرکزی دونوں رکنیت کے لیے معذرت کر لی۔ کیونکہ شدید اور بڑی حد تک بے فائدہ مصروفیات کے باعث اُن کی فطری شاعری کا جوہر وکالت اور دیگر نجی کام ٹھپ ہو کر رہ گئے تھے۔ اور صحت بھی بری طرح متاثر ہو رہی تھی اور یہ ہونا ہی تھا کیونکہ وہ سیاسی عہدہ میں مالی فائدہ کے حصول کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہاں اپنی جان ضرور وقف کر دی۔ آج کل کے سیاستدانوں سے موازنہ کریں تو اقبال کی بے لوث طمع لالچ سے پاک جگر کاوی اور عرق ریزی پر حیرت ہوتی ہے۔

اگرچہ ان کے کلام اور تحریر کے موضوعات خالصتاً سیاسی نہیں مگر مضمرات بڑی حد تک

---

① عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، دیہات سدھار، تعلیم، مالیہ صحت وغیرہ پر تقریریں و تجاویز ص ۱۴۳-۱۴۶، جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۵۵۱-۵۵۲۔

② کلیات اقبال اردو، ص ۵۳۵۔

سیاسی ہیں۔ ان کا یہ حسنِ کلام کسی حسنِ عمل سے کم نہیں۔ بلکہ بہت بڑی Dynamic Force ہے۔

اقبال کے اسلاف کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ انھیں کشمیری قوم سے محبت اور ہمدردی تھی۔ انھیں غربت اور پسماندگی سے نکالنا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ وہ متحد ہو کر جدوجہد کریں۔ ۱۸۹۸ء میں جب وہ گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھے ، انجمن کشمیری مسلمانان کے جلسہ میں ان کے مطالبات کے حق میں نظم پڑھی۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر ①

اس کے علاوہ جب بھی ضرورت پڑی وہ اہالیانِ کشمیر کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

۱۹۰۰ء میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں نظم "نالۂ یتیم" پڑھی جو نہایت مقبول ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں انجمن ہی کے جلسہ میں نظم تصویرِ درد سنائی جس نے تمام ہندوستان میں انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ نمونے کے چند شعر اس طرح ہیں:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں ②

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

---

① منشی محمد دین فوق، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، بزم اقبال کلب روڈ، لاہور، ص ۳۶۔

② کلیاتِ اقبال اردو، ص ۷۱۔ روزگار فقیر، جلد دوم، دردیدۂ معنی نگہباں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت، ص ۲۲۔

محبت سے ہی پائی ہے شفاء بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

وہ ہر سال انجمن کے اجلاس میں جوش وجذبہ سے معمور اصلاحی مذہبی سیاسی نظمیں سناتے جن کا لوگ سال بھر انتظار کرتے رہتے۔

۱۹۱۱ء میں انھوں نے معرکتہ آلاراء نظم شکوہ پڑھی اور کچھ عرصہ بعد "جواب شکوہ" ۱۹۲۲ء میں لاجواب نظم "خضرِ راہ" سنائی جو ایک جامع سیاسی منشور ہے۔ جس میں زندگی، سلطنت، طرزِ حکومت، سرمایہ اور محنت کی باہمی آویزش، مغربی جمہوریت کا کھوکھلا پن آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ اسی طرح شمع و شاعر، طلوعِ اسلام جیسی نظموں نے جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست سے خلافت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر بددل شکستہ مسلمانوں کو بہت سہارا دیا اور نوجوان ترکوں کی مجاہدانہ کوششوں سے خلافت کو جمہوریت میں بدلنے اور مصطفی کمال کے ہاتھوں اتحادیوں کی شکست پر اپنے کلام میں بے پایاں مسرت اور نوید صبح کا مسرت سے اظہار کیا ہے اس طرح کی کئی نظمیں مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، ساقی نامہ، فاطمہ بنت عبداللہ، صقلیہ "حضور رسالت مآب میں" جنھوں نے اسلامیانِ ہند کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا۔ اور وہ انگریزی سے آزادی حاصل کرنے کے جذبہ سے سرشار ہو گئے۔ اسی طرح ان کی اجتہادی کتابیں اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، بالِ جبریل، پیامِ مشرق، Reconstruction of Religious Thought in Islam، جاوید نامہ نے مسلمانوں کے جذبہ فکروعمل وحریت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اقبال کی پیغمبرانہ اور مجتہدانہ شاعری میں وہ تاثیر ہے جو کسی بھی خفتہ قوم کو راہ عمل پر گامزن کر سکتی ہے۔ ان کے نہایت عزیز دوست مولانا گرامی فارسی کے بے بدل شاعر اقبال کو اپنے خطوط میں ہمیشہ "مجدد عصر" کہہ کر خطاب کرتے اقبال کے بارے میں ان کا مشہور شعر ہے:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

واقعی اقبال کا کلام الہامی ہونے میں کوئی شک نہیں اس بارے میں اقبال کے اپنے چند اشعار پیش ہیں:

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ مِلّت کو پیغامِ سروش①

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دِگر دانائے راز آید کہ ناید

(انھوں نے واقعی دانائے راز ہونے کا حق ادا کر دیا)

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟
میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ دُرونِ میخانہ②

خدا نے اُن کو دیدہ بینا دیا تھا جو عقل کی فراست سے کہیں آگے تھا۔ عقل کو کہتے ہیں۔

رازِ ہستی کو تُو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں③

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص۱۸۹۔
کہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش
سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید، عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۲۲۲۔

② کلیاتِ اقبال اردو، ص۱۹۵، ۳۴۳، ۳۵۶۔

③ ایضاً، ص۳۱۔

غرضیکہ ان کی الہامی شاعری کا وہی مقصد ہے جو پیغمبروں کو دیا جاتا ہے یعنی بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانا ان کی اخلاقی مذہبی معاشرتی طرز زندگی کو سنوارنا اور صحت مند معاشرہ پیدا کرنا یعنی:

شعر کجا و من کجا شعر و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبال کی زندگی میں شعور تک پہنچتے ہی جذبۂ عشق بیدار و نمودار ہو جاتا ہے۔ اسے حصولِ علم سے اوائل عمری سے عشق ہو جاتا ہے اور ہندوستان سے بھی جہاں اس نے جنم لیا اور اس کے تمام باشندوں سے بھی وہ ہندوستان کو دنیا کا سب سے اچھا ملک قرار دیتا ہے اور اس کے باسیوں کو بلا تفریق مذہب و ملت باہم رشتۂ محبت و خلوص میں سرشار و شادماں دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے جذبات کو اس نے نہایت خوبصورت نظموں میں بیان کیا ہے۔ جو سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔ مثلاً ترانہ ہندی، "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، "چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا"۔ مگر جب بھی ہندو مسلم فساد کے واقعات ہوتے ہیں تو اُسے بے حد دکھ اور ملال ہوتا ہے کہ سب لوگ مذہب کی تفریق بھول کر آپس میں بھائیوں کی طرح کیوں نہیں رہتے؟ وہ اس تفرقہ کا الزام تنگ نظر مذہبی رہنماؤں کو دیتا ہے۔ اس کا اظہار اُس نے اپنی مشہور نظم شوالہ میں کیا ہے۔ جو سامعین کرام کے ذوقِ طبع کے لیے دہرانا مناسب ہے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — ترے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تُو خدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو — اس ہر دوار دل میں لا کے جسے بٹھا دیں
سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو — اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زنار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو — یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا — ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اس کا پانی — اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں
ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے — بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو — آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں
اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو — دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں
ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا — رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے ①

آپ دیکھیں گے کہ اس میں ہندی آمیزش اردو میں کتنی مٹھاس اور جذبہ باہمی کی کیفیت ہے۔ ان آشتی پریم اور پیار کے گیتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مخالفین اقبال اور ہندوں کا اقبال کو فرقہ پرست، متعصب، تنگ نظر اور جہاد پرست مسلمان کہنا کتنا غلط ہے۔ حالانکہ یہ نظم پڑھنے کے بعد اقبال پنڈت نہرو، راجگو پال اچاریہ اور ٹیگور سے زیادہ سیکولر نظر آتا ہے۔ یہاں سوال کیا جائے کہ ان کی نظموں کا سیاست سے کیا تعلق ہے تو عرض ہے کہ جو فکر کلام اور عمل کسی ملک اور اس کے باشندوں کے مذہبی، سماجی، کاروباری، باہمی ربط وضبط اور ثقافت میں ارتقاء کا باعث بنے وہ سیاست کے زمرے میں آتا ہے۔ اقبال معروضی حالات کے مطابق ان امور کی ترقی کے لیے باہمی اتحاد کو بے حد اہمیت دیتا ہے جو یقیناً سیاسی نکتہ نظر کے زمرے میں آتا ہے امن و آشتی کی فضا برہم ہو جائے تو وہ انتہائی دکھ درد سے اس طرح دُکھ بھرا احساس ظاہر کرتا ہے۔

---

① ایضاً، ص ۸۸۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تُو مجھے
سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قُربِ فراق آمیز ہے (۱)

مگر اقبال کا ہندو مسلم امن و آشتی و اتحاد کی دلی تمنا کا یہ آبگینہ جسے اس نے ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، تصویرِ درد جیسی پریم بھری نظموں سے ایک سندر موہنی مورتی کی صورت میں بڑے چاؤ اور رچاؤ سے من مندر کے استھان پر سجا رکھا تھا۔ بہت جلد ہندو تعصب کی مسلم نفرت کے ہاتھوں کے چکنا چور ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں اُسے ایک متحد قوم کے طور پر مل جل کر رہنے کا خیال ہمیشہ کے لیے ترک کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور پھر دو قومی نظریہ اور جداگانہ انتخاب اُس کی سیاسی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے۔

ہوا یوں کہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے آبادی کی بنیاد پر بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جس سے مسلم اکثریت والے حصے کو اقتصادی، معاشی اور سیاسی طور پر فائدہ پہنچتا تھا اور پسماندہ مسلمان کاشتکاروں اور مزدوروں کو ہندو سرمایہ داروں کے استحصال سے بچ کر ترقی کا راستہ ملتا تھا۔ اس منصفانہ تقسیم کے خلاف ہندوؤں نے نہایت پُرتشدد احتجاج و مظاہرے شروع کر دیے۔ مسلمانوں نے اپنے حقوق کے حفاظت کی خاطر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ مگر طاقت ور ہندو لابی کے آگے حکومت جھک گئی اور ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال منسوخ کر دی۔ جس سے ہندوؤں کی بدنیتی اور اصلیت کی قلعی کھل گئی اور واضح ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کو ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنی صدیوں کی محکومی کا بدلہ انھیں غلام بنا کر اتارنا چاہتے تھے۔ اس واقع نے ہندو مسلم تعلقات کو ہمیشہ کے لیے خراب کر دیا۔ اس سے یہ تاثر بھی پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا بیرونی حاکم سے تعاون کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ بہ نسبت کہ وہ ہندو سامراج کے ساتھ مل کر تحریک آزادی میں تعاون کریں جو انھیں اپنا غلام بنا لے گی۔ (۲)

---

(۱) ایضاً، ص ۳۲۔
(۲) عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۹۹۔

اس دوران ۱۹۰۵ء میں اقبال گورنمنٹ کالج سے چھٹی لے کر اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔ جہاں سے وہ بار ایٹ لا اور فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر تین سال بعد واپس وطن لوٹے۔ لندن میں اقبال کی زندگی نے نیا موڑ لیا۔ انھوں نے مسلمان قوم کی پسماندگی اور یورپین قوموں کی ترقی کا فرق محسوس کیا وہ یورپ کی ترقی سے متاثر ضرور ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یورپین قوموں کی مادیت پرستی، باہمی قومی نفرت کے نتیجہ میں ایک دوسرے پر بالادستی کے لیے جنگی تیاریاں، تجارتی منڈیوں پر قبضہ کے لیے رقابت، نوآبادیات کو غلام بنا کر ان کا استحصال کرنا۔ ان مشاہدات کے نتائج نے انھیں سرمایہ داری نظام سے بدظن کر دیا۔ جو ان اشعار سے ظاہر ہے۔

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے ①

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو اک زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا ②

اور مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے بچنے کے لیے کہا:

"گرچہ ہے دل کشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بام دانہ و دام سے گذر ③

وہ لندن میں مسلمان طالبعلم کے طور پر گئے تھے۔ مگر مذکورہ مشاہدات کے زیر اثر پکے مومن بن کر لوٹے ان کے دل میں اسلامیان عالم کی کھوئی ہوئی شان و شوکت دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ موجزن ہو گیا۔ ان کی شاعری نے نیا رخ اختیار کیا۔ جس میں مسلمانوں کو بیدار

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۴۷۔
② ایضاً، ص ۱۴۱۔
③ ایضاً، ص ۳۲۱۔

کرنے اور عالم انسانیت کی اصلاح کا فریضہ اپنا لیا۔

لندن میں وہ سیاسی سرگرمیوں سے الگ نہیں ہوئے۔ ہندوستان میں ان دنوں سودیشی تحریک چل رہی تھی۔ اقبال نے اس میں دلچسپی لی اس کے حق میں ان کا مضمون ہندوستانی رسالہ زمانہ میں چھپا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ملک سیاسی طور پر آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کی اقتصادی حالت مضبوط نہ ہو انھوں نے سیاسی رہنماؤں پر واضح کیا کہ آزادی کی تحریک کی بنیادی ضرورت اقتصادی استحکام ہے۔ اس سے پیشتر وہ ۱۹۰۴ء میں نہایت اہم کتاب علم الاقتصاد لکھ چکے تھے کہ ہر فرد کو اقتصادی طور پر مضبوط ہونے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے ملک کو بھی استحکام ملتا ہے۔

لندن میں قیام کے دوران اسلام کے خلاف الزامات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ایک اسلامی سوسائٹی بنی جس میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ ہندوستان میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد انگلینڈ میں سید امیر علی کی سرکردگی میں مسلم لیگ کی ذیلی شاخ بنی جس میں رکنیت حاصل کر کے مسلم لیگ کے پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔ حالانکہ وہ کانگریس کے کسی جلسہ میں بھی شریک نہ ہوتے تھے۔[1] اس لیے یہ کہنا کہ وہ مجبورانہ طور پر مسلم لیگ میں شامل ہوئے حقائق کو جھٹلانا ہے۔

لندن سے واپسی پر مسلمانوں کی پسماندگی اقبال کو بے چین رکھتی انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں پہلی فارسی مثنوی، اسرار خودی شائع کی جس میں فلسفۂ خودی کی وضاحت کی کہ افراد پر لازم ہے کہ وہ خود کو پہچانیں اور ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کردار کی بلندی اور خودی کی تکمیل کریں۔ یہ پیغام اس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

۱۹۱۸ء میں دوسری فارسی مثنوی رموز بیخودی شائع کی کہ افراد کو اپنی نشوونما کرتے

---

[1] عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۵۷۔

ہوئے اپنے انفرادی مفادات کو ملی مفادات کے تابع کر دینا چاہیے تاکہ افراد اور قوم دونوں کو سربلندی حاصل ہو۔ یعنی یوں کہنا چاہیے کہ:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ دونوں کتابیں اگرچہ اصلاحی پیرایہ میں ہیں مگر ان کی روح سراسر سیاسی اور مسلمانوں کو روبہ عمل کرنے والی ہے ایک مشہور مستشرق نے کہا کہ اسرار خودی مسلمانوں کو جنگ وجدل پر ابھارنے کے لیے لکھی گئی ہے مگر ڈاکٹر نکلسن مترجم اسرار خودی نے اسے تمام انسانیت کے لیے مفید اور تعمیری قرار دیا۔ ①

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو اتحادیوں کے مقابلے میں شکست ہوئی تو لیگ آف نیشن جسے اقبال کفن چوروں کی جماعت کہتے تھے۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

ان کفن چوروں میں برطانیہ، فرانس، روس بااثر ممالک تھے انھوں نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کی ناکامیوں کا بھرپور بدلہ لیا۔ خلافت عثمانیہ کو "ترکی" کے سوا زیر خلافت مسلمان ممالک سے محروم کر کے آپس میں بندر بانٹ کر لی اس طرح مسلمانوں کے بین الاقوامی اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ان کا مستقبل تاریک کر دیا خلافت ختم ہو گئی اور ترک خلیفہ اتحادیوں کا آلہ کار بن کر رہ گیا۔ مگر غیرت مند جوشیلے، ترقی اور انقلاب پسند ترک نوجوانوں نے اتاترک مصطفی کمال پاشا کی سرکردگی میں خلیفہ کو معزول کر کے جمہوریت کی داغ بیل ڈال دی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اختتامِ خلافت پر صفِ ماتم بچھ گئی علی برادران محمد علی شوکت علی کے علاوہ ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر انصاری جیسے جوشیلے مذہبی رہنماؤں نے اختتام خلافت کے خلاف مظاہروں کی قیادت کی۔ مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان بھیجا کہ حکومت کو خلافت کی بحالی پر آمادہ کیا جائے اقبال کے نزدیک یہ ایک نامناسب اور وقار کے

---

① روز گارِ فقیر، جلد دوم، ص ۱۶۷۔

خلاف طریقہ تھا جس میں سوائے ناکامی کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ بھلا گدایانہ طریقے سے حکومتیں خیرات میں ملتی ہیں؟ اس پر اقبال نے انھیں یوں سمجھایا۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی ①

اس وقت عالم اسلام ترکی کے انقلابی رہنما اتاترک کے اقدامات پر سخت مشتعل تھا جس نے خلافت کو ختم کر دیا اور مغربی ترقی سے متاثر ہو کر ترقی میں بنیادی اصلاحات شروع کر دیں لیکن اقبال نے ان کی تبدیلیوں کی مذمت نہیں کی اس کے برعکس اس کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ حقیقتاً دنیا کے اسلامی ممالک میں تنہا ترکی ہی خواب غفلت سے بیدار ہوا ہے اور خود آگاہی حاصل کر لی ہے یہ تبدیلی زبردست ذہنی، اخلاقی جدوجہد کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جو ترکی کے مستقبل میں متحرک تبدیلیاں لائے گی جس سے ملک ارتقاء کی طرف بڑھے گا اور بہتر نتائج نکلیں گے اقبال نے طرز حکومت کی اس تبدیلی کو ترکوں کا اجتہاد کہہ کر مسلمانوں کی مجتہدانہ کوششوں کی حمایت کی۔ ②

پھر خلافت کے حامیوں نے تحریک خلافت شروع کر دی کہ ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے یعنی دشمن کا ملک جس سے ہجرت کر کے اسلامی ملک میں جانا چاہیے اور انگریزوں کی ملازمتیں، خطابات تعلیمی اداروں کی مراعات مالی امداد اور دیگر تمام سہولتیں واپس کر دینی چاہئیں۔ ناسمجھ مسلمانوں نے گاندھی کو اس تحریک کا مرکزی لیڈر بنا دیا۔ جس نے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کا پروگرام بنایا۔ اس طرح مسلمان خود ہی ہندو شاطروں کے جال میں پھنس

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۵۳۔
② ڈاکٹر رفیق زکریا، اقبال شاعر اور سیاستدان، ص ۱۱۱۔

گئے۔ کیونکہ اس احتجاج کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمان اپنا کاروبار ملازمتیں بچوں کی تعلیم ختم کر کے اپنی املاک کو اونے پونے ہندوؤں کے ہاتھ بیچ کر افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے مگر اس برادر اسلامی ملک کے لوگوں کے ہاتھوں لٹ پٹ کر اس طرح تباہ و برباد ہو گئے کہ ان کی لاشوں کو کفن تو کیا دفن کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اس تحریک کی غلطی کے اقبال شروع سے ہی خلاف تھے انھوں نے برملا مخالفت کی کہ اس سے پسماندہ مسلمانوں کا تھوڑا بہت اثاثہ بھی برباد ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور کی درسگاہیں بند ہو جائیں گی جب کہ ہندوؤں کے ۱۲۰ اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود تھے۔ محمد علی جوہر وغیرہ نے جامعہ ملیہ بنانے کی سکیم بنائی۔ گاندھی اور مولانا جوہر دونوں نے اقبال کو اس میں پرنسپل کا عہدہ پیش کیا۔ جس کا اقبال نے تحریک خلافت کے خطرات بتاتے ہوئے انکار کر دیا۔ [1] محمد علی جناح بھی اس تحریک کے خلاف تھے ور اقبال کی حکیمانہ دانش نے واضح طور پر تحریک کے نتائج محسوس کر لیے تھے جو بری طرح ناکام ہو گئی۔ اس خلافت کی اہمیت تو اسی سے واضح ہے کہ ہندوستان جیسی مسلم سلطنت انگریز کے قبضے میں چلی گئی مگر خلیفہ ان کی امداد کو کیا پہنچتا کلمہ افسوس بھی نہ کہہ سکا۔

ویسے بھی مولانا جوہر و معاونین وغیرہ کا عمل مدعی ست، گواہ چست والی بات تھی۔ خود ترک اختتام خلافت اور جمہوریت کے اجرا پر خوش تھے۔ مگر مولانا جذباتی ہمدردی میں ان کی مرضی کے خلاف انھیں بوسیدہ بیمار خلافت کی تاریک غاروں میں دھکیل کر نئے دور کی علمی برکات اور ترقی سے محروم کر رہے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ ترکی خلافت کی بحالی کے لیے مولانا محمد علی جوہر اور ہمنواؤں نے اندرون ملک اور برطانیہ میں جس طرح پر زور احتجاج کیا۔ اس کا نتیجہ منفی نکلا اور ہندوستان کے مسلمان معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی طور پر تباہ ہوتے ہوتے بچے انھوں نے اقبال کو بھی پر اصرار انداز میں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی مگر اقبال صاحب بصیرت و وجدان اور دانائے راز تھے۔ کس طرح غلط عمل کی حمایت کرتے اس ضمن میں عرض کرتا چلوں کہ ہمارے عظیم رہنما علامہ اقبال اور قائداعظم دونوں بیرسٹر اور اعلیٰ پایہ کے قانون دان تھے۔ دونوں نے

---

[1] جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۳۰۹۔

ہمیشہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے باوقار طریقے سے سیاست کی اور اپنے ذہن، قلم اور کلام سے انگریز حکومت اور ہندو کانگرس کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے دونوں احتجاجی سیاست جیل جانا، ہڑتالیں کرنا، اشتعال انگیز نعرے لگانا اور جلوس نکالنا، پرتشدد مظاہرے کرنا، گاندھی کی طرح مرن برت رکھنا یا بھوک ہڑتال وغیرہ کے خلاف تھے کاش کہ ہمارے آج کل کے سیاسی اور مذہبی رہنما بھی ان کے نقش قدم پر چل سکیں تاکہ وقت، توانائیاں اور وسائل ضائع نہ ہوں اور ملک پرامن فضا میں مسلسل ترقی کر سکے۔

اقبال جمہوری نظام پسند کرتے تھے مگر وہ مغربی جمہوریت کے خلاف تھے جو سرمایہ داری نظام پر مبنی تھی جس کا اظہار انھوں نے مشہور نظم خضرِ راہ میں نہایت موثر انداز میں کیا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

وہ ایسے جمہوری نظام کے حق میں تھے جس میں جدید عادلانہ خطوط پر عوام کو ملکی معاملات میں شرکت کا حق دیا جائے۔ جس کا اظہار یوں کیا ہے:

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو[1]

اسی طرح وہ تحریک آزادی ہند میں اصل فریق انگریز اور ہندو کانگریس کو نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ یہ ہندوستان کا اکثریتی فرقہ اور اقلیتیں ہیں جو مغربی طرز کی مخلوط انتخاب کی جمہوریت کو قبول نہیں کر سکتیں۔ جب تک کہ ان کو ہندوستان کے اصل حالات زندگی کے مطابق نہ ڈھال لیا جائے۔

اقبال نے موتمر عالم اسلام کی حمایت کی اور ترکی میں جمہوریت کے قیام کی موافقت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال ملوکیت کے بالکل حق میں نہیں تھے اور تمام نئے اسلامی ممالک میں رائج شخصی حکومت کو ناپسند کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا بے حد ملال تھا کہ ان مسلمان ممالک میں بھی حکومتیں جغرافیائی اور علاقائی قومی بنیاد پر الگ الگ مقامی مفاد کو ترجیح دیتی ہیں اور اسلامی بھائی چارے کے نظریے سے دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں سے کوئی ترجیح

---

[1] کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۵۲۔

سلوک نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ علاقائی، نسلی، رنگ و بو کی بنیاد پر قوم کی تشکیل کو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف سمجھتے تھے وہ تو قائل تھے کہ:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی ①

مگر یہاں وطنیت کے تعصبات نے ہر ایک کو اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے انھوں نے اپنی نظم وطنیت میں علاقائی وطنیت کے مضر اثرات کا بڑا واضح نقشہ کھینچا ہے وہ علاقائی وطنیت کو انسانیت کے لیے تباہی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ توحید کی بنیاد پر سارے تفرقات مٹا کر چاہتے ہیں:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے ②

اقبال دین کی بنیاد پر ہر ملک کے مسلمانوں کو ایک اسلامی قرار دینے میں اس حد تک سنجیدہ تھے کہ جب مولانا حسین احمد مدنی نے تقریر میں کہا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں تو اقبال کی روح تڑپ اٹھی اور انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی تردید کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا، عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

---

① ایضاً، ص ۲۷۰۔
② ایضاً، ص ۱۶۰۔
③ ایضاً، ص ۶۹۱۔

مسلمانوں کی بے اتفاقی اور غیروں کی ریشہ دانیوں کی وجہ سے پورا نہیں ہو رہا اور عالم اسلام کی موجودہ زمانے میں شکست خوردگی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ آپس میں متحد نہیں ہیں نہ مقامی سطح پر نہ بین الاقوامی سطح پر۔

۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نتیجہ میں مرکز اور صوبوں کے اختیارات تقسیم اور متعین ہو گئے یہ جمہوریت کی طرف پیش قدمی تھی عوام میں سیاست اور الیکشن میں حصہ لینے کا جوش و شوق پیدا ہو گیا اور مسلم لیگ جو تحریک خلافت کی وجہ سے نیم جان تھی پھر سے زندہ ہو گئی۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء اقبال کا پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں بطور ممبر کارگزاری کا حال بیان ہو چکا ہے۔ اس دوران ہندوستان میں سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء میں ہند نظام حکومت کی آئینی پوزیشن کا جائزہ لینے کے لیے آیا اس کے سب ممبر انگریز تھے جس پر محمد علی جناح، کانگرس، علی برادران اور ان کے ہمنواؤں نے اختلاف کیا اور اسے توہین سمجھا گیا مگر سر محمد شفیع اور اقبال نے کمیشن کی موافقت کی ان کا خیال تھا کہ متحارب گروپوں کے نمائندے ایک نتیجہ پر متفق نہیں ہو سکتے۔ انھیں ہندو ممبروں سے زیادہ انگریزوں کی غیر جانبداری پر اعتماد تھا اس پر جناح نے پنجاب لیگ ختم کر دی تو سر شفیع اور اقبال نے الگ مسلم لیگ بنالی۔ اقبال سیاسی قلابازیوں سے متنفر تھے مگر نااتفاقی اس بات پر تھی کہ جناح مشروط انتخاب پر رضامند تھے مگر اقبال اور شفیع ہندو کانگریس کی متحدہ قوم پرستی کے خلاف تھے کہ اسلامی عالمگیری مساوات کے خلاف ہے اور ہندی مسلمانوں کو ایک مشترکہ قوم میں سمو کر ان کے جائز اقلیتی حقوق سے محروم کرنے کی چال ہے جس سے وہ ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے اقبال ہندو کے خلاف نہیں تھے مگر مسلمانوں کی بقاء چاہتے تھے اقبال انگریز حکومت کو ہندو کانگرس سے زیادہ بھروسے کے قابل سمجھتے تھے جو محض وعدوں کے شور سے وعدوں پر ہی ٹرخاتی تھی اور کڑک مرغی کی طرح حقوق کا ایک انڈہ بھی نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ شروع سے اپنی دو شرائط پر قائم رہے۔

۱- مسلم اکثریت کے صوبوں میں آبادی کے لحاظ سے نمائندگی

۲- جداگانہ انتخاب اور صوبائی خودمختاری۔

چونکہ جناح مشترکہ انتخاب پر راضی ہو گئے تھے اس لیے اقبال ان سے ناراض ہو گئے

اور اقبال کے موقف کی تصدیق ہوگئی جب موتی لال نہرو اپنی نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء میں میثاق لکھنؤ اور دہلی تجاویز میں جداگانہ انتخاب کے طے شدہ اصولوں سے منحرف ہو گیا اور مرکز اور صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کم کر دی سندھ کو الگ صوبہ بنانے اور دیگر مطالبات کو مسترد کر دیا غرضیکہ رپورٹ سراسر اس زعم پر مبنی تھی کہ کانگرس کو سوراج حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کی کوئی پرواہ نہیں۔

پھر بھی جناح نے کہا کہ نہرو رپورٹ میں ضروری ترامیم کر کے مسلمان اسے قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن ترامیم پر بھی کانگرس آمادہ نہ ہوئی غرضیکہ ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلہ جناح کی آخری کوشش بھی ناکام ہوئی اور اقبال کا موقف کہ ہندو لیڈر کبھی سمجھوتہ نہیں کریں گے درست ثابت ہوا۔ مزید براں لندن میں تین گول میز کانفرنسوں کی شرمناک ناکامی نے بھی اقبال کے زاویہ نظر پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

اس پر آل انڈیا مسلم کانفرنس وجود میں لائی گئی اقبال اس کے بانیوں میں تھے زیر صدارت سر آغا خان ۲۶ دسمبر ۱۹۲۸ء کو اس کا اجلاس ہوا اقبال نے اہم بصیرت افروز تقریر کی اس میں جناح مسلم لیگ کے علاوہ دوسری مسلم جماعتیں بھی شریک ہوئیں۔ اس میں مسلمانوں کے مطالبات مرتب کرنے میں وفاقی مرکز میں مسلمانوں ایک تہائی سیٹیں، صوبائی خودی مختاری، جداگانہ انتخاب کے مطالبات وغیرہ میں اقبال نے اہم کردار ادا کیا۔

نہرو رپورٹ میں جناح کی ترامیم کی نامنظوری کے تلخ تجربہ کے بعد جناح کو احساس ہو گیا کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن نہیں اس کے ساتھ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو مطالبات اپنی قرارداد میں شامل کر رکھے تھے۔ ان میں اضافہ کی گنجائش ہے جو انھوں نے اس میں شامل کیے اس کے ساتھ ہی اقبال سر شفیع اور جناح کا نکتہ نظر ایک ہو گیا آپس میں جو اختلافات تھے وہ ختم ہو گئے اور دونوں لیگوں کا اتحاد محمد علی جناح ۲۸ جنوری ۱۹۳۰ء کے چودہ نکات پر ہو گیا اور اقبال کے آخری دم تک قائم رہا بلکہ شفیع لیگ ختم کر دی گئی اور اتحاد میں رخنہ ڈالنے والے نیشنلسٹ مسلمان ڈاکٹر ذاکر انصاری، مولانا آزاد، ڈاکٹر کچلو اور چوہدری خلیق الزمان مسلم لیگ سے رخصت ہو گئے۔ ①

---

① جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۵۲۰-۵۳۴۔

جنوری ۱۹۲۹ء میں اقبال نے چوہدری محمد حسین اور عبداللہ چغتائی کے ہمراہ جنوبی ہند کا دورہ کیا اور تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے موضوع پر مدراس، میسور، بنگلور، حیدرآباد اور علی گڑھ میں نہایت عالمانہ خطبات ارشاد فرمائے۔ ان میں انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنے نظریات کی تفصیل سے وضاحت کی اور حیرت انگیز نظریات پیش کیے۔ جو مروجہ نظریات کے مقابلے میں جدید دور کے حالات کے تقاضوں کے مدِ نظر ترقی پسندانہ اور اجتہاد پر مبنی تھے۔ یہ خطبات اعلیٰ پایہ کی انگریزی انشاء میں تھے۔ جنھیں انتہا پسند عناصر نے توجہ نہ دی یا سمجھ نہ سکے۔ ورنہ لاہور کی وزیر خان مسجد کے خطیب مولوی دیدار علی کی طرح ایک اور کفر کا فتویٰ لگا دیتے۔[1]

۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اقبال نے بیرون دہلی دروازہ برطانیہ کی یہود نواز پالیسی اور فلسطین کو ان کا وطن بنانے کی پالیسی کے خلاف زبردست پرجوش تقریر کی اور اس کو امن عالم کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا۔

اقبال کی خواہش تھی کہ آنے والی گول میز کانفرنس سے پیشتر مسلمانوں کا آپس میں مکمل اتحاد ہو اور ممکن ہو سکے تو ہندو مسلم اتحاد بھی۔ تاکہ گول میز کانفرنس کے نتائج حوصلہ افزا برآمد ہوں۔ اس بارے میں انھوں نے برکت علی محمڈن ہال لاہور میں بڑی دردمندانہ تقریر کی۔

۱۳ جولائی ۱۹۳۰ء کو محمد علی جناح نے لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا تاکہ گول میز کانفرنس کے لیے پالیسی وضع کی جائے۔ اس کو آخری شکل دینے کے لیے خاص اجلاس بلایا جائے اور اس کی صدارت کے لیے جناح نے اقبال کا نام تجویز کیا جو بالاتفاق منظور ہو گیا۔ چنانچہ یہ اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ جس میں اقبال کو سیاست کے میدان میں کل ہند سطح پر بہت اہم مقام حاصل ہو گیا۔ اس صدارتی خطبے میں انھوں نے دو قومی نظریہ کے جواز، اہمیت اور اس کی تشکیل کا خاکہ پیش کیا۔ جس کا مسلمانوں میں خیر مقدم کیا گیا۔ مگر ہندوؤں نے کھل کر اس کی مذمت کی۔ اس وقت ان کے سامنے الگ ملک کا تصور شمال مغربی ہند مسلمان صوبوں تک محدود تھا۔ یعنی پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان۔ یہ ایک قدرتی طور پر مربوط خطہ

---

[1] ایضاً، ص ۵۳۴۔

تھا۔ وہ اسے ایک ملک بنانا چاہتے تھے۔ بنگال اور دوسرے اکثریت صوبوں کو آزادانہ طور پر فیصلے کے اختیار پر چھوڑ گیا مقصد یہ تھا جو فیصلہ شمال مغربی ہند کے لیے ہوگا خود بخود دوسرے صوبوں کے لیے بھی ہو جائے گا۔ یہ بات جناح کے نام اقبال کے خطوط سے پوری طرح واضح ہے۔

یہ الگ اسلامی مملکت کی تجویز آئندہ گول میز کانفرنس کا دیباچہ کہی جا سکتی ہے۔ جس کے تحت ہندوستان میں وفاقی حکومت ہوگی۔ جس میں مسلم اکثریت والے صوبوں میں اکثریتی حقوق اور باقی ہندوستان میں آبادی کی نسبت سے نشستیں ملیں گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ اصول کہ ہر فرقے کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر آزادانہ ترقی کرے۔ اس کا فرقہ پرستی اور تعصب سے کوئی تعلق نہیں۔ میں دوسرے فرقوں کے رسم و رواج، عقائد و قوانین، مذہبی سماجی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ (۱) اگر چہ ہندوؤں نے اقبال پر مذہبی تعصب اور ہندوؤں سے نفرت کے الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اقبال ہندو مذہب کے بھی عالم تھے اور قدر دان بھی۔ ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ رومن کوڈ جو مغربی قانون اور ضوابط کی ماں ہے چاروں ویدوں اور شاستروں سے اخذ شدہ ہے۔ اعلیٰ شاعری اور نظریات میں یونانی ہندوستانیوں کے شاگرد تھے۔ جو فلسفیانہ نظریات میں نہایت اعلیٰ سطح پر پہنچ چکے تھے۔ اقبال ویدوں اور گیتا کے بہت معترف تھے۔

ان کے فلسفۂ خودی کے جوہر عمل اور استغناء کو سری کرشن کی گیتا سے کافی مماثلت ہے۔ اس ضمن میں عظیم جنگ مہا بھارت کے واقع کی مثال دی جاتی ہے۔ جب سوتیلے بھائیوں کورو اور پانڈوؤں کی افواج آمنے سامنے ایک دوسرے کو فنا کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ پانڈوؤں میں ارجن جو بے مثل تیر انداز تھا۔ اپنے بالمقابل اپنے ہی عزیز و اقربا کو دیکھا تو غم اور مایوسی میں تیر کمان پھینک کر جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر بھگوان سری کرشن جو ارجن کے رتھ بان تھے۔ ارجن کو سمجھایا کہ حق و باطل کی جنگ ہے عزیز و اقارب وہ ہوتے ہیں جو دوسرے کا حق دیتے ہیں چھینتے نہیں۔ تمھارا ان سے حق کی سربلندی کے لیے استقامت سے جدوجہد کرنا انسانی کردار کی کامیابی و استحکام کے لیے ہے۔ جس میں انسان نتائج کی پرواہ کے بغیر حق کا ساتھ دیتا ہے اور یہ راستہ تکمیل خودی کی طرف جاتا ہے... اقبال کا ارادہ تھا کہ گیتا کا منظوم ترجمہ

---

(۱) ایضاً، ص ۵۳۶۔

کریں جو پہلے ابوالفضل کا بھائی فیضی کر چکا تھا۔ کیونکہ اس نے گیتا کے خیالات کی بلندی کی منصفانہ ترجمانی نہیں کی تھی۔ جاوید نامہ میں بھی اقبال نے فلک قمر پر ہندو رشی وشوامتر جسے عارف ہندی اور جہاں دوست کہا گیا ہے۔ رومی اور اقبال کے ساتھ نہایت عالمانہ سوالات و جوابات میں گفتگو ہوئی۔ اس کے علاوہ ہندو عالم راجہ بھرتری ہری کا بھی ذکر ہے جس کے ایک شعر کا ترجمہ بطور سفر نامہ اقبال نے بال جبریل کے شروع میں لکھا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

غرضیکہ اقبال ہرگز متعصب اور ہندوؤں سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ویدوں، راجہ رام چندر، سری کرشن، گوتم بدھ، سوامی رام تیرتھ گرونانک وغیرہ پر تعریفی نظمیں لکھیں ہیں۔ اور ان کے قریبی دوستوں میں بہت سی ہندو شخصیتیں تھیں۔ یہاں یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اسلام میں وجودی تصوف جس کی بیل کی گھنیری زلفوں میں اصل تصوف گم ہو چکا ہے۔ فلسفہ ویدانت کا ہی مرہون منت ہے۔ جس میں برہما یعنی ذات مطلق تمام کائنات کی تخلیق کار ہے۔ اور سبھی تخلیقات "ہمہ اوست" کے نظریہ کے تحت برہما کی عظیم اپرم پار ہستی کا جز رہیں۔ ورتناسخ اور آواگان کے مراحل تک ہیں کہ اپنی ہستی کو فنا کر کے برہما کی ہستی مطلق میں سما جائیں۔ ایران میں وجودی تصوف کے پودے کو سینچنے والے حافظ شیرازی اور بیشمار شاعر مل گئے۔ مگر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ ①

---

① روزگار فقیر، جلد دوم، ص ۴۴۔ سری کرشن کی توصیف کے لیے صفحہ ۴۴ پر دیباچہ اسرار خودی ملاحظہ فرمائیں۔ جو اسرار خودی سے نکال دینے کے باعث کمیاب ہونے کی وجہ سے محفوظ رکھنے کے لیے چھاپا ہے۔ سری کرشن نے گیتا میں عمل اور ترک عمل کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ اقبال کے عمل کو تقاضائے فطرت قرار دیا ہے جو اسلام کا پیغام ہے اور تکمیل خودی کا بنیادی عنصر ہے۔ اقبال ہندو ویدوں کا بھی معترف ہے۔ مثال کے لیے رگ وید کی نظم کا اردو میں ترجمہ آفتاب کے عنوان سے بانگ درا کے صفحہ ۴۳ پر ہے۔ جس پر مسجد وزیر خاں لاہور کے خطیب مولوی دیدار علی نے اقبال کے آفتاب کو خالق جو صرف خدا کی صفت ہے کا حامل بیان کرنے پر کفر کا فتویٰ عاید کر دیا۔ اس کے علاوہ اور الزامات پر بھی۔ جس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مذکورہ مولوی کی بھرپور مذمت کی۔ آج کل اس قماش کے انتہا پسند مذہبی ٹھیکیداروں نے خودکش حملوں و تباہی بربادی سے جو اسلام کو اقوام عالم میں بدنام کر رہے ہیں وہ بے حد تشویشناک ہے۔

ذکر ہو رہا تھا گول میز کانفرنس کا جس میں ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنما اپنی تجاویز لے کر گئے تھے تاکہ ان کے مطابق آئین کو وضع کیا جائے اور اقبال پہلی گول میز کانفرنس کے وقت اجلاس آلہ آباد کے تاریخی خطبے میں مصروف تھے۔ لیکن اس گول میز کانفرنس کے وقت مسلمان مندوبین سے باقاعدہ رابطے کیے ہوئے تھے اور جداگانہ انتخاب اور الگ اسلامی ریاست کے قیام کے مطالبہ کو اولیت دینے پر زور دیتے رہے۔ تاہم دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں وہ شریک ہوئے۔ دوسری کانفرنس میں اپنے مطالبات پر مدلل تقریر کی۔ مگر کانگریس رہنماؤں کی ہٹ دھرمی کے سبب حقوق کا تصفیہ نہ ہو سکا۔ گاندھی زبانی ہامی بھرتے تھے مگر کوئی ضمانت نہ دیتے تھے۔

تیسری گول میز کانفرنس کا نتیجہ پہلے ہی سے ناکامی نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا اقبال نے اس میں برائے نام شرکت کی۔ الگ اسلامی ریاست کے بارے میں اقبال نے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ اس کا مقصد مذہبی حکومت کا قیام نہیں۔ اسلام کہیں کسی مذہبی ادارے کی برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ ریاست اخلاقی نظریات کی حامل ہوگی۔ جس میں اختلافی نظریات کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کا قیام ہندوستان کے بہترین مفاد میں ہے۔ جس سے اندرونی توازن ہوگا۔ دونوں حصوں میں امن و سلامتی ہوگی اور ہندوستان کی مسلم ریاست عرب سامراجیت کی چھاپ سے آزاد ہوگی نیز ہندوستان کی حفاظت کے لیے سرحد کا کام دے گی۔

کانفرنس میں اقبال کے موقف کو پنجاب کے مسلمانوں نے بہت سراہا۔ اقبال کی مسلم ریاست کی کوششوں کی بدولت ان کے زیر اثر زیادہ لوگ متحد ہو [illegible] کا شاندار استقبال ہوا اور انھیں [illegible] اتفاق رائے سے کل ہند مسلم کانفرنس کا صدر منتخب [illegible] جو مسلم لیگ سے زیادہ نمائندہ تنظیم سمجھی جانے لگی۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو [illegible] کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ جس کے صدارت اقبال نے کی۔ مسلم آبادی کے خطوں میں انھوں نے سارے فرقوں میں اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ اقبال کو اس بات سے بہت تکلیف ہوئی تھی کہ ایک ہندو لیڈر مذہب کے بارے میں جو بات یا تبلیغ چاہے کرتا رہے پھر بھی قوم پرست کہلاتا ہے اور اگر مسلمان اسلام کی بات کرے تو فوراً فرقہ پرست قرار دیا جاتا ہے۔ ①

---

① جاوید اقبال، زندہ رود، گول میز کانفرنس، ص ۵۰۹-۵۱۳۔

اقبال کے کامیاب سیاست دان کہلانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انھوں نے مسلم بقاء کے لیے ایک اہم اقلیت کی صورت میں ہندوستان کی مخلوط قوم کی نفی کرتے ہوئے الگ قومی حیثیت منوائی ۔ جس کے نتیجے میں ہندو اور مسلم قوموں کے علاقوں اور آبادی کے لحاظ سے اسمبلیوں میں نشستوں کی تعداد اور جداگانہ طریقۂ انتخاب تسلیم کیا گیا۔ متحدہ فیڈریشن میں صوبائی خودمختاری کا حق تسلیم کیا گیا اور شمال مغربی چار صوبے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان قدرتی طور پر ایک مربوط مسلم اکثریت علاقہ بنے۔ اس کے لیے ہندوستان میں الگ آزاد مملکت کے مطالبے کو پاکستان کا خاکہ بنا کر پیش کیا گیا جو ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو جیتی جاگتی مملکت کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر جلوہ گر ہوا۔

گول میز کانفرنسوں کے بعد حکومت نے قرطاس ابیض شائع کیا۔ جس میں ہر پارٹی اور فرقے کے حقوق کا تعین کیا گیا۔ مگر سبھی نے قرطاس ابیض پر سخت تنقید کی۔ مسلمانوں کو بھی ان کے تناسب سے کم سیٹیں دی گئیں۔ اقبال کی رائے میں وائٹ پیپر میں ترمیم کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اسقام دور ہوں۔

اقبال نے ۲۲ رفروری ۱۹۳۳ء کو دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ترکی کے مشہور مجاہد اور آزادی کے ہیرو رؤف پاشا کے لیکچروں کی صدارت کی۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو اقبال سخت علیل ہو گئے اور ان کے گلے کا صوتی نظام خراب ہو گیا۔ آواز سے تقریباً محروم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد بصارت بھی تقریباً جواب دے گئی اور دیگر کئی عوارض لاحق ہو گئے۔

۲۴ راکتوبر ۱۹۳۴ء کو محمد علی جناح لندن سے واپس ہندوستان آ گئے۔ جس کے لیے اقبال اور دیگر لیگی زعما نے انھیں واپس آ کر مسلمانوں کی سیاسی کشتی سنبھالنے کی درخواست کی تھی۔ اگر اقبال کو جناح سے کدورت یا شکوہ ہوتا تو وہ کبھی انھیں واپس آنے کی درخواست نہ کرتے۔ تاہم وہ خود شدید بیماری کے باوجود قوم کی بہتری کے لیے جہاں تک ہو سکا سیاسی رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ قائداعظم اقبال کی علالت کے دوران ان کی مزاج پرسی کے لیے آئے۔ اقبال نے کامیابی کے لیے انھیں لیگ کو عوامی جماعت بنانے کا پرزور مشورہ دیا اور عوام کے حقوق دلوانے کی تلقین کی۔ جب تک لیگ عوامی جماعت نہیں بنے گی کامیابی سے

دور رہے گی۔ قائداعظم نے اس بات کو تسلیم اور پسند کیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کو علالت کے باوجود نمائندہ جلسہ میں صوبائی پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو کی گئی اور اقبال کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ①

انھوں نے ہمنواؤں کی مدد سے مسلم لیگ کا حلقہ اثر عوام تک پھیلا دیا۔ چنانچہ انتخابات میں لیگ کے امیدواروں کو سوائے سرحد کے صوبے میں بے حد کامیابی ہوئی۔

نہرو کے لیے یہ بات بڑی تشویش کا باعث تھی۔ اس نے دہلی میں آل انڈیا کنونشن بلا کر مسلمان عوام کو پرکشش وعدوں سے گھیرنا چاہا جس کے جواب میں اقبال نے نہرو کنونشن کے جواب میں لیگ کو بھی ایسی کنونشن بلانے کے لیے جناح کو لکھا تاکہ کانگریس کی لن ترانیوں کا نہ صرف مؤثر جواب دیا جائے بلکہ مسلمانوں کو مزید مستحکم و منظم کیا جائے اور مسلم لیگ کو جلد از جلد عوامی بنایا جائے کیونکہ عوام کی نیابت کے بغیر کوئی جماعت زندہ نہیں رہ سکتی اور مسلمانوں کو افلاس سے بچانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔ اس طرح اور اہم سیاسی امور میں خصوصاً یونینسٹ پارٹی کا زور توڑنے اور اس سے تعلق قطع کرنے اور سٹوڈنٹ فیڈریشن کی تنظیم کے لیے بے حد مفید مشورے دیے۔

انھی دنوں نہرو نے مسلم عوامی رابطہ کی تحریک شروع کی میاں افتخار الدین کے ہمراہ اقبال سے ملنے آئے۔ ملاقات کے دوران میاں افتخار الدین نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے" مسلمان جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں آپ کانگریس سے بات چیت کریں گے تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ اقبال سمجھ گئے کہ آپس میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جواب میں اقبال نے پُرجوش انداز میں کہا کہ مسٹر جناح ہی مسلم قوم کے اصل لیڈر ہیں۔ میں تو ان کا معمولی سپاہی ہوں۔ اقبال مسلمانانِ ہند سے چاہتے تھے کہ وہ جناح کے ہاتھ مضبوط کریں۔ جو متحدہ محاذ لیگ کی سربراہی میں ہی ہو سکتا ہے۔ اگر لیگ کامیاب ہو گئی تو جناح کے سہارے۔ اس کے سوا اور کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اقبال کو ایک مغربی طریق زندگی گزارنے والا شخص جو ٹھیک طرح عوامی زبان میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا اس کی قیادت پر اتنا یقین اور اعتقاد تھا۔ یقیناً یہ اقبال کی وجدانی بصیرت تھی۔ ②

---

① ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، اقبال صاحب حال، ترتیب پبلشرز، فیصل آباد، ص ۵۳۔ ۲۵۲۔

② جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۱۰۲۳۔

اسی طرح قائد اعظم نے اقبال کی وفات پر فرمایا کہ اقبال میرے لیے ایک مخلص دوست، رفیق اور راہنما تھے۔ لیگ کو نازک ترین لمحوں میں گزرنا پڑا۔ مگر وہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوئے۔ ان کی انتھک جدوجہد سے پنجاب پورے طور پر مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہے۔ اقبال سے بہتر کسی نے اسلام کو نہیں سمجھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کام کیا گیا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ سچا، وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ قائد اعظم نے کہا کہ کارلائل کو کسی نے برطانیہ اور شیکسپیئر میں ایک کو چننے کے لیے کہا تو اس نے شیکسپیئر کو ترجیح دی مجھے بھی اگر سلطنت مل جائے اور اقبال میں کسی ایک کو منتخب کرنے کو کہا جائے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا۔ [1] سچ تو یہ ہے کہ اقبال اول آخر مسلم لیگ کی رُوح تھے ان کے بارے میں یہ وہم پیدا کرنا کہ انھوں نے مسلم لیگ سے قوم پرستی کے حوالے سے مجبوراً تعاون کیا۔ سورج پر تھوکنے کے مترادف ہے۔

قارئین کرام! اس مختصر سے وقت میں حضرت علامہ اقبال کے سیاسی کارناموں کا احاطہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو نابغۂ عصر انسان تھے جو ہزاروں سال کے انتظار کے بعد دھرتی پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا عام انسانوں کے ساتھ ان کے اوصاف کا مقابلہ کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ سیاسی میدان میں جب ہندو لیڈر شپ کی شاؤنزم اور چانکیہ پن نے مسلمانوں کے جائز حقوق غصب کرنے کی ٹھان لی۔ اپنی اکثریت کے تکبر میں وہ نہ مسلمانوں کو کسی خاطر میں لاتے تھے اور نہ ان کے راہنماؤں کی پیش کردہ تجاویز کو۔ کیونکہ وہ اکھنڈ بھارت میں ہندو راج کا خواب دیکھ رہے تھے تو ان کے دوغلے پن اور کہہ مکرنیوں کا انداز شروع ہی سے اقبال کو ہو گیا تھا۔ جو مسلمانوں کی بقاء کے لیے جداگانہ انتخاب اور الگ مسلم ریاست کے مطالبے پر جم گئے اور کوئی بھی انھیں اپنے موقف سے نہ ہٹا سکا۔ مگر دوسرے مسلم رہنما بار بار اپنی تجاویز ٹھکرائے جانے پر بھی کسی خوش فہمی میں ہندوؤں سے سمجھوتے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ اس صورتحال سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کی یاد آتی ہے۔ جس کا ذکر اقبال کے اس مصرع میں ہے:

---

[1] ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، اقبال صاحب حال، ص ۲۵۴۔

علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش!

اللہ تعالیٰ نے عملی زندگی میں اقبال کو حصولِ پاکستان کے لیے "خضرِ راہ" کا مقام دیا۔ جس کی رہبری نے بالآخر حصول پاکستان کی منزل تک پہنچا دیا۔ اگر خدانخواستہ اکھنڈ بھارت بن جاتا تو مسلمانوں آج تک مسئلہ کشمیر کی طرح ہندو سامراج کی بھول بھلیاں میں ذلت وخواری سے ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔ آخر میں حضرت اقبال کے لیے غالب کے اس شعر سے معروضات ختم کرتا ہوں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

حضرت میاں میرؒ بحوالہ علامہ اقبالؒ

علامہ اقبال صوفیاء کرام کے بے حد عقیدت مند تھے اور جب بھی موقع ملتا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے۔ ان کا پختہ اعتقاد تھا۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں ①

صوفیاء کرام میں حضرت میاں میر بھی ان کے محبوب صوفی تھے۔ انھوں نے اپنی مثنوی میں حضرت میاں میر سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پندو موعظت اور تربیت کو اپنی سرزمین اور اہل وطن کے لیے احیائے ایمان اور مشعل راہ قرار دیا ہے۔ اتباع رسول کریم ﷺ میں ان کے قدم کو مستحکم اور ان کے عمل کو عشق و محبت کی جان بتایا ہے۔ انھوں نے پنجاب کی سرزمین کو اپنے رشد و ہدایت سے منور کر دیا۔ بھٹکے ہوئے انسانوں کو نیکی کی راہ دکھائی۔ گرتے ہوئے معاشرے کو انتشار و ابتری سے بچایا۔ پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کو نشاۃِ ثانیہ بخشی اور تنزل و انحطاط کے دور میں احیائے ملت و اعلائے کلمۃ الحق کی ایمان افروز کوششیں کیں۔

اقبال نے لکھا ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اگر جہاد میں یہ مقصد پیش نظر نہ ہو اور جہاد زمین پر قبضہ کرنے کی ہوس کے لیے ہو تو ایسا جہاد اسلام میں حرام ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے فارسی مثنوی میں حضرت میاں میر کے ایک واقعہ کو نظم کیا ہے۔ جس کا ترجمہ یوں ہے۔ ②

---

① کلیات اقبال اردو، ص ۱۰۳۔

② کلیات اقبال فارسی، جوع الارض کے خلاف متعلقہ اشعار، ص ۹۳۔

گفت ما را این زر حق سلطان ماست — آنکہ در پیراہن شاہی گداست
حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است — شاہ ما مفلس ترین مردم است
دیدہ او از اجانب دوخت است — آتش جوعش جہانے سوخت است
خلق در فریاد از ناداریش — از تہیدستی ضعیف آزاریش
آتشِ ... بیار گدا جوعِ گداست — جوعِ سلطان ملک و ملت را فناست

حضرت میاں میر کے ارادت مندوں میں بادشاہ وقت بھی تھا۔ جس کی ہوس ملک گیری بے حد بڑھ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مزید علاقہ جات پر قبضہ کر لے اور اس مقصد کے لیے طویل عرصہ سے مصروف جنگ تھا۔ ایک دن یہ بادشاہ حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب دعا ہوا کہ اسے ملک گیری میں مزید کامیابی ہو۔ حضرت میاں میر یہ سن کر خاموش رہے۔ اتنے میں ایک مرید حاضر ہوا اور اس نے چاندی کے چند سکے بطور نذر پیش کیے اور کہا کہ حضور میں نے یہ سکے محنت سے حاصل کیے ہیں۔ اس حقیر نذر کو قبول فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ روپیہ ہمارے اس بادشاہ کو دے دو۔ جو اب بھی بادشاہی لباس میں ایک گدا ہے۔ اگرچہ اس کی حکومت وسیع علاقوں پر پھیلی ہوئی ہے پھر بھی یہ اپنی حرص و ہوس کی وجہ سے مفلس ترین لوگوں میں ہے اور دوسروں کے دستر خوان پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس کی حرص و ہوس کی بھوک نے زمانے کو جلا کر تباہ کر دیا ہے۔ اس کی ناداری سے خدائی مخلوق پریشان ہے۔ اس نے اپنے فکرِ خام سے لوٹ مار کا نام تسخیر دیا ہوا ہے۔ فقیری کی آگ تو اُسی تک رہتی ہے مگر بادشاہ کی بھوک کی آگ ملک و ملت کو تباہ کر دیتی ہے مگر جس نے بھی تلوار غیر اللہ کے لیے اٹھائی۔ بالآخر اس کی تلوار نے اسی کو ختم کر دیا۔

جس طرح اقبال نے حضرت میاں میر کی قناعت، استغناء، حق گوئی و بے باکی اور انسانی عمل کی صحیح سمت کو واضح کیا ہے۔ یقیناً ان کی ذات میں مزید قابل تعریف پہلو ہوں گے۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت میاں میر کی زندگی کا مجملاً ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ جس سے آپ کی شخصیت کا سراپا واضح طور پر سامنے آئے گا۔

تاریخ نے حضرت میاں میر کی کوئی تصنیف نہیں بتائی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو وقت گفتگو و خیالات کو تحریر کرنے میں صرف ہوتا ہے اس سے بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مصروف رہا جائے گویا ان کی زندگی سراپا عمل تھی۔ ان کی زندگی کے حالات کا علم زیادہ تر ان کے مرید اور حد درجہ عقیدت مند مغل شہزادے داراشکوہ کی دو معروف و اہم کتب سکینۃ الاولیاء اور سفینۃ الاولیاء سے ملتا ہے۔ اگر یہ تصانیف نہ ہوتیں تو حضرت میاں میر کی زندگی کے بیشتر حالات سے آگاہی نہ ہوتی۔ (۱)

---

(۱) داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، ترجمہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، ص ۱۰۲۔

ہمارے ممدوح صوفی و ولی کا نام نامی محمد میر اور کنیت میر تھا۔ والد کا نام قاضی سائیں دتہ تھا۔ جو نہایت بلند پایہ عالم تھے اور سندھ میں اپنے علم و فضل و تقدس کے اعتبار سے ممتاز مانے جاتے تھے۔ حضرت میاں میر سندھ کے مشہور شہر سیون شریف میں پیدا ہوئے۔ دارشکوہ کی کتاب سکینۃ الاولیاء میں ان کی پیدائش کا سال ۱۵۵۰ء لکھا ہوا ہے۔ سات سال کی عمر میں والد وفات پا گئے، والدہ نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا فریضہ سنبھالا۔ جو خود بڑی عالم اور زہد و تقویٰ میں رابعہ بصری کا نمونہ تھیں۔ نانا کا نام قاضی قادن تھا جو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ گویا حضرت میاں میر علیہ الرحمۃ قاضی خاندان سے تھے۔ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا تھا۔ مسلکاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے سلسلہ قادریہ پر کاربند تھے۔ گویا اس طرح آپ نسباً فاروقی، مسلکاً و مشرباً حنفی و قادری تھے۔ ①

ابتدائی تعلیم والدہ سے حاصل کر کے ان کی اجازت سے علائق دنیا سے منہ موڑ کر سلسلہ قادریہ میں حضرت شیخ خضر سیوستانی کے مرید ہوئے۔ جن سے عبادات، ریاضت اور مجاہدے کی تربیت شاقہ کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

۲۵ سال کی عمر میں جب جلال الدین اکبر حکمرانِ ہند تھا۔ لاہور تشریف لائے، جہاں مولانا سعد اللہ و مفتی عبدالسلام لاہوری کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے رہے۔ جن کے تلامذہ میں مادھول لال شاہ حسین بھی تھے۔ آپ لاہور میں بزرگانِ دین کے مقابر یا باغات میں درخت کے نیچے اکیلے یادِ حق میں دن گزارتے۔ نماز کے وقت مریدوں کے ہمراہ باجماعت نماز ادا کرتے اور رات کو عبادت میں مشغول رہتے۔ جب ان کی ولایت کی شہرت ہوئی اور معتقدین بڑھنے لگے تو ہجوم سے بچنے کے لیے سرہند چلے گئے جہاں وہ بیمار پڑ گئے۔ مگر ایک مرید حاجی نعمت اللہ نے اتنی جانفشانی سے خدمت کی کہ صحت یاب ہو گئے۔ چنانچہ خدمت کے اعتراف میں انھیں سلوک کے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔

سرہند میں ایک سال قیام کے بعد دوبارہ لاہور آ کر محلہ خان پور میں مقیم ہو گئے اور اصلاحِ فکر و تہذیب اور روحانی صفات سے خلفاء اور مریدانِ باصفا کی ایسی جماعت پیدا کی جس سے رشد و ہدایت کا قادریہ سلسلہ ہر سُو پھیل گیا۔ آپ مریدوں کی تعلیم و تربیت پر خاص

---

① تحفۃ الکرام، جلد سوم، ص ۱۳۸۔

توجہ دیتے اور انھیں نمائشی زہد و تقویٰ سے بچنے کی تلقین کرتے۔

واقعہ ہے کہ خواجہ بہاری جو آپ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایک دفعہ اپنے گھر میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ چھت کے گرنے کے آثار پیدا ہوئے۔ خواجہ بہاری نے لوگوں کو فوراً باہر چلے جانے کو کہا لیکن خود اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ اور بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھتے رہے۔ چنانچہ چھت گر گئی مگر جس جگہ وہ بیٹھے تھے اس جگہ چھت کی دو کڑیاں باہم مل رہیں اور خواجہ بہاری محفوظ رہے۔ یہ بات لوگوں نے حضرت میاں میر علیہ الرحمۃ کو بتائی کہ وہ سن کر خوش ہوں گے مگر انھوں نے ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ہائے حُبِّ جاہ و شہرت کی طلب کہ لوگ دیکھ لیں کہ خواجہ بہاری مرتے وقت بھی خدا کو یاد کرتا رہا۔ فرمایا کہ کلمہ طیبہ دل میں پڑھا جاتا ہے۔ آپ خودنمائی کے بے حد خلاف تھے اور فقیرانہ لباس یا پھٹی پیوند شدہ گودڑی پہننا پسند کرتے تھے کہ لوگ ظاہری روپ دیکھ کر پہنچا ہوا بزرگ سمجھ کر ہاتھ چومتے اور عقیدت مندی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح کشف و کرامات کا اظہار ناپسند اور کارخانہ قدرت میں دخل اندازی سمجھتے اور سالک کی راہ میں حجاب قرار دیتے اور فرماتے کہ کشف! باسرِ اُو کفش۔ (یعنی کشف کے سر پر جوتا)۔ ①

خودنمائی کی تردید میں وہ حضرت داتا گنج بخش کو قول نقل کرتے کہ سلوک کی راہ گودڑی پہننے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ منزل اللہ کی محبت، ریاضت و محبت سے ملتی ہے۔ جو شخص طریقت سے آشنا ہو گیا اس کے لیے امیرانہ لباس بھی گودڑی ہے غرضیکہ وہ خودنمائی، حبِ جاہ اور ریاکاری کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔

حضرت میاں میر حسنِ اخلاق کا پیکرِ مجسم تھے۔ جس کی وجہ سے اہل اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں میں بھی نہایت ہر دلعزیز اور لائق تعظیم تھے۔ جو کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر باہمی اخلاص و محبت اور انسانی ہمدردی کے زریں اقوال سن کر تسکین اطمینان کی دولت سے بہرہ مند ہو کر لوٹتے۔ اس حقیقت کے ثبوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ سکھوں کے گرو ارجن سنگھ نے مقدس گردوارہ امرتسر کی بنیاد آپ کے ہاتھوں سے رکھوائی۔ ②

آپ کے پاس ایک تونگر شخص حاضر ہوا اور اپنے شدید بیمار بیٹے جس کے بچنے کی امید نہیں تھی صحت یابی کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا لوگوں کی عجیب حالت ہے۔ چاہتے ہیں

---

① تذکرہ حضرت میاں میر، نام و نمود سے نفرت، ص ۶۳۔

② دارالشکوہ سکینۃ الاولیاء، ترجمہ مقبول بیگ بدخشانی، ص ۸۵۔

کہ درویشوں سے دعا کرا کے سارے مسئلے حل کرالیں اور کچھ محنت اور خرچ نہ کرنا پڑے۔ پھر فرمایا کہ میں ضمانت دیتا ہوں کہ تم بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور ننگے بدنوں کو کپڑے پہنا دو تو اس کی برکت سے مشکل حل ہو سکتی ہے۔ اس شخص نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا اور بعد میں آ کر حضرت کو خوشی خوشی بتایا کہ اس کا بیٹا صحت یاب ہو گیا ہے۔ ①

تعلیمات کے سلسلہ میں وہ شریعت کے اتباع پر زور دیتے۔ مریدوں کو ارشاد کرتے کہ سلوک میں پہلا مرتبہ شریعت کا ہے۔ طالب پر لازم ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر عمل کرے۔ جس کی برکت سے خود بخود دل میں طریقت کی خواہش پیدا ہو گی اور طریقت کے حقوق بھی احسن طریقے سے ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ بشریت کا حجاب اس کی آنکھوں سے دُور کر دے گا اور اس پر حقیقت کا مفہوم منکشف ہو گا۔ جو روح سے متعلق ہے۔ طریقت، باطن کی طہارت اور مرتبہ حقیقت کا درک ہے اور حقیقت کا مفہوم موجود کو فانی بنانا اور دل کو ماسوا اللہ سے خالی کرنا ہے جو درجہ قرب الٰہی تک پہنچاتی ہے۔ نفس، دل اور روح کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی اصلاح مقصود ہے۔ نفس کی اصلاح شریعت سے، دل کی طریقت سے اور روح کی حقیقت سے ہوتی ہے۔

حضرت میاں میر اس پایہ کے صوفی تھے جو فنا فی اللہ کی منزل میں تھے۔ ان کا تمام وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا۔ وحدت الوجود ان کا منتہائے نظر تھا۔ مرقوم ہے کہ آپ کو شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فتوحاتِ مکیہ کا کافی حصہ حفظ تھا۔ اور مولانا جامی کی شرح فصوص الحکم پوری حفظ تھی۔

اس کے علاوہ وہ اعتدال پسند تھے چونکہ وحدت الوجود پر شدت تعلق کے بعد شریعت اور طریقت میں توازن رکھنا مشکل ہے۔ لہٰذا وہ اس فلسفے کی موشگافیوں میں نہ پڑتے اور طالب کو پابندی سے شریعت پر عمل کرنے کی تلقین کرتے۔ ②

حضرت میاں میر نہایت صلح جو اور کم گو تھے۔ جہاں اشاروں سے بات سمجھ سکتے وہاں زبان استعمال نہ کرتے۔ وہ کام اور عمل کو باتوں پر ترجیح دیتے۔ آپ ظاہری اور باطنی علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اگر کبھی قرآن و سنت کے مفاہیم بیان کرتے تو علماء و فضلاء انگشت بد

---

① سکینۃ الاولیاء، ص ۳۸۔

② ایضاً ص ۲۶۔

نداں رہ جاتے۔ علم فقہ میں بھی کمال دسترس تھی۔ اس تمام علمی تبحر کے باوجود قیل وقال اور بحث وتمحیص سے اجتناب کرتے۔ مناظر کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مگر ایک دفعہ مناظرے کے حالات پیدا کردیئے گئے تو آپ کی دانش روحانی کے باعث اس کی نوبت نہ آسکی۔

واقعہ یوں روایت ہے کہ ملکہ نور جہاں اور اس کے بھائی آصف جاہ نے سنی علماء کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لیے ایک ایرانی مجتہد کو بلایا۔ جو دہلی جانے سے پہلے حضرت میاں میر کے پاس لایا گیا۔ حضرت بڑے اخلاق سے ملے۔ دورانِ گفتگو سرراہے پوچھا کیا آپ نے کبھی کربلائے معلیٰ کی زیارت کی ہے۔ مجتہد نے بشاشت سے جواب دیا۔ جی ہاں! خدا کا شکر ہے کئی بار یہ سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس مقام کی کچھ فضیلت بیان فرمائیں۔ مجتہد کہنے لگا کہ اس خاک پاک کی ادنیٰ خاصیت یہ ہے کہ اس کے اردگرد سات کوس تک دفن ہونے والے روزِ حشر بغیر کسی حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ حضرت نے فرمایا: کیا ایسی فضیلت انبیاء کرام کے مزارات کو بھی حاصل ہے؟ کیوں نہیں، مجتہد نے کہا نبیوں کے مزارات کے دس کوس تک دفن ہونے والے بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ تب حضرت نے فرمایا کہ اگر حضور اکرم ﷺ کے مزار کے چاروں طرف دس کوس تک مدفون لوگ جنتی ہیں تو پھر ان دو بزرگوں کی بخشش بھی یقینی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے قدموں میں دفن ہیں۔ یہ سن کر ایرانی مجتہد مبہوت ہو گیا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ القصہ وہ لاہور سے ہی واپس ایران چلا گیا۔ ①

حضرت میاں میر صرف زاہد خشک نہیں تھے۔ ان کے نزدیک سماع ضرور حدود کے ساتھ مباح تھا کہ ہر عارفانہ کلام خوش الحانی کے ساتھ دلوں کو گرماتا اور فکر ونظر میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس سے قلوب واذہان تسخیر ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم کی قرات خود اس کی مثال ہے۔ مگر حضرت میاں میر شاہ حسین کی طرح نہ تو موسیقی میں غرق رہتے نہ وہ سلطان باہو کی طرح اس کے منکر۔ خوش الحانی اللہ کی نعمت ہے جس کا مناسب اور برمحل استعمال جائز ہے۔ ②

حضرت میاں میر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے تمام عمر پارسائی اور تجرد میں گزاری اور شادی بیاہ اور بال بچوں کے بکھیڑے میں نہ پڑے۔ سلسلہ قادریہ میں تجرد یعنی انقطاع

---

① تذکرہ حضرت میاں میر، ص ۱۱۲۔

② اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۷: ۹۰۔

من العلائق و خلائق کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کی قربت کے راستوں کی رکاوٹ ہیں۔ ان کو ترک کرنا انتہائی کٹھن ہے۔ مگر حضرت میاں میر دنیاوی اور نفسانی خواہشات پر مکمل حاوی رہے جو صرف ایک فنا فی اللہ ولی ہی کر سکتا ہے۔

علائق دنیا سے استغنا اور بے نیازی ہی نے حضرت میاں میر کو وقت کے کسی سلطان کا مرہونِ منت نہ ہونے دیا۔ وہ عام آدمیوں سے تحفہ قبول کر لیتے اور تھوڑا سا خود بھی استعمال کرتے مگر باقی تمام دوسروں پر تقسیم کر دیتے۔ اس ضمن میں سلاطین وقت کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

حضرت میاں میر کی جب شہرت ہوئی تو شہنشاہ جہانگیر حکمران تھا۔ جب اُسے حضرت کی شخصیت اور علمی اقدار کا پتہ چلا تو آپ سے حسنِ ظن رکھنے لگا۔ دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں لکھا ہے۔

اگر چہ جہانگیر اولیاء اللہ اور درویشوں کا معتقد نہ تھا اور ان کو تکلیف دیتا اور بدسلوکی کرتا تھا۔ مگر اس نے اپنا خاص ایلچی حضرت میاں میر کی خدمت میں بھیج کر ملاقات کی درخواست کی۔ ان کی آمد پر جہانگیر نے آپ کے بے حد تعظیم و تکریم کی اور بہت دیر تک حضرت کے دلپذیر نصائح نصیحت توجہ سے سنے۔ بادشاہ اس قدر متاثر ہوا اور کہا کہ اگر آپ حکم دیں تو میں تخت و تاج چھوڑ کر آئندہ آپ کی خدمت میں ہی رہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ کا وجود اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے ضروری ہے۔ اور آپ کے عدل و انصاف کی وجہ سے عوام اور درویش لوگ دلجمعی سے اپنی عبادت میں مگن رہتے ہیں۔ تاہم اگر آپ اپنی جگہ پر کسی عادل حکمران کو لا سکتے ہیں تو میں آپ کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ بادشاہ کو یہ بات اچھی لگی اور جھجکتے ہوئے کہا کہ مجھ سے کچھ طلب کیجیے؟ اس پر آپ نے کہا کہ جو کچھ مانگوں گا وہ دو گے؟ جہانگیر نے کہا، ضرور! آپ نے فرمایا تو پھر مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔

اس شانِ استغناء کو اقبالؒ کی شاعرانہ زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے:

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے!
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا[1]

---

[1] کلیات اقبال اردو، ص ۱۸۰۔

اس واقعہ کے علاوہ دارا نے جہانگیر کے دو خطوط نقل کیے ہیں جن میں حضرت کا ذکر نہایت احترام سے کیا گیا ہے۔ گویا بقول اقبال:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ ①

شاہجہاں کا دورِ حکومت آیا تو وہ دو مرتبہ حضرت میاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کتاب شاہجہان نامہ میں اس ملاقات کا تفصیل سے ذکر ہے۔ شاہجہاں نے اس نشست و قربت کو اپنے لیے بڑی خوش نصیبی سمجھا کہ اسے اس پیشوائے صلحا کی صحبت کا اعزاز حاصل ہوا... وہ بار بار حضرت کے پاکیزہ کردار اور اخلاق محمود کی تعریف کرتا اور انھیں مشائخ و صوفیا کی صف میں کامل و اکمل پایا۔ شاہجہاں کی حضرت میاں میر سے دوسری ملاقات کا ترجمہ اس طرح ہے۔

حق شناس بادشاہ اصحاب معرفت و تقویٰ کے رہنما، ارباب صفات و صفا کے پیشوا، برگزیدہ حق شناس درویش یعنی حضرت میاں میر کے کاشانہ فیض آشیانہ پر جو پہلے بھی اس کے قدوم سعادت لزوم سے مہبطِ انوار ہو چکا تھا، تشریف لے گئے اور اس تجرد و خلوت گزیں ہستی کے بہت سے باریک نکات اور معرفت پرور حقائق حاضرین کے انشراح صدور اور انبساط قلب کا باعث ہوئے۔ ②

اس موقع پر شاہجہاں نے ایک سفید پگڑی اور تسبیح حضرت کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کی اور دعا کی التجا کی۔ ان دونوں ملاقاتوں کا دارا شکوہ نے مفصل حال لکھا ہے۔ بادشاہ حضرت میاں میر سے اتنا متاثر ہوا کہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہم نے ترک و تجرید اور ماسوا اللہ سے بے نیازی اور لاتعلقی میں حضرت جیسا درویش نہیں دیکھا۔ ③

دارا نے شاہجہاں کی حضرت میاں میر سے نیاز مندی کے بیان میں اپنی بیماری اور حضرت کی دعا سے شفایابی کا حال بھی لکھا ہے کہ وہ چار ماہ سے کسی جانکاہ مرض میں مبتلا تھا۔

---

① ایضاً، ص ۳۶۶۔
② اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۹۰۸۔
③ مدینۃ الاولیا، ص ۱۳۲۔

شاہی معالج عاجز آ گئے تو شاہجہان اسے لے کر حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے دارا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیالے میں پانی ڈالا اور کچھ پڑھ کر شہزادے کو پینے کو کہا۔ اس کے پیتے ہی ہفتہ تک دارا کو کامل شفا نصیب ہو گئی۔ (۱)

دوسری ملاقات کے موقع پر بھی حضرت نے نہایت لطیف و دلچسپ نکات بیان کیے۔ بادشاہ نے درخواست کی کہ آپ توجہ فرمائیے کہ میرے دل میں دنیا کی محبت باقی نہ رہے۔ انھوں نے فرمایا جب تم کوئی ایسا عمل کرو کہ کسی مسلمان کا دل خوش ہو جائے تو خدا تعالیٰ سے اپنے لیے دعا کرو۔ مگر اللہ سے اس کی ذات کے سوا کچھ نہ مانگو۔

دارا شکوہ حضرت سے بہ نسبت اپنے باپ شاہجہان اور دادا جہانگیر کے حضرت میاں میر سے زیادہ انسیت رکھتا تھا اور دل و جان سے ان کا معتقد تھا۔ حضرت کی روحانی صحبت اور نظر کرم نے شہزادے کے ذوق و شوق کو جلا بخشی۔ دارا نے سکینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت میاں میر شاہجہاں کی ملاقات کے دوران لونگ چباتے تو پھینک دیتے اور یہ فقیر کمال ارادت اور اخلاص سے انھیں اٹھا کر کھا لیتا تھا۔ جس کی برکت سے طبیعت کو بہت روحانیت ملی۔ جب بادشاہ رخصت ہوا تو دارا ان کے پاس ہی رک گیا اور اپنے سر کو حضرت کے پائے مبارک پر رگڑنے لگا۔ انھوں نے بہت شگفتگی اور خوشی سے اپنا دست مبارک اس فقیر کے سر پر رکھ کر عرش تک پہنچا دیا اور بہت لطف و کرم سے رخصت کیا۔ (۲)

دارا شکوہ بیان کرتا ہے کہ حضرت کی توجہ و کرم بعد از وصال بھی فقیر کے شامل حال رہی اور اس نے خواب میں حضرت کی زیارت کی۔ انھوں نے میرے سینے سے اپنے سینے کو رگڑا اور فرمایا کہ اپنی امانت کو سنبھالو۔ اس کے بعد انوار و تجلیات کی اتنی بارش ہوئی کہ میں نے عرض کیا کہ اس سے زیادہ کی مجھ میں ہمت نہیں۔ مگر اس کے بعد میں اپنے سینے کو گویا نہایت معطر اور نورانی پاتا ہوں۔ (۳)

دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں گہرے اختلافات تھے۔ ایک وجہ اختلاف شاہجہان کی دارا کو اورنگ زیب پر فوقیت دینا تھی۔ جسے اس نے ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔ مگر ان کے مزاج

---

(۱) ایضاً ص ۵۲۔

(۲) مدینۃ الاولیاء، ص ۵۳۔

(۳) ایضاً ص ۵۴۔

اطوار، عقائد اور طرزِ عمل میں بھی زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دارا شکوہ وسیع المشرب اور بھگتی تحریک سے متاثر تھا جب کہ اورنگ زیب نہایت متشرع بلکہ بنیاد پرست علماء کا شیدائی تھا۔ دارا شکوہ اگرچہ ولی عہد سلطنت تھا مگر وہ جہانبانی کے تقاضوں کو چھوڑ کر دینیات، تصوف اور مطالعہ میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اورنگ زیب اس سے کم عمر ہونے کے باوجود شروع سے ہی فنِ حرب میں مہارت حاصل کر چکا تھا اور شاہجہان کی بیماری کے دوران میں اس نے دارا شکوہ کو شکست دے کر حکومت سنبھال لی۔

دارا شکوہ حضرت میاں میر کا بے حد معتقد تھا۔ اورنگ زیب اگرچہ دارا کی صوفیانہ روش کے خلاف تھا تاہم اس کے دل میں بھی حضرت میاں میر سے حسنِ ظن رکھتا تھا۔ دارا کے قتل کے بعد جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو اس نے حضرت میاں میر کے روضۂ پاک کی عمارت مکمل کرائی۔ جو دارا سے نامکمل رہ گئی تھی۔ ○

حضرت میاں میر ۸۸ برس کی عمر میں ۱۶۳۵ء میں دنیائے دنی سے رخصت ہو گئے۔ وفات سے ایک روز قبل لاہور کا حاکم وزیر خان ایک حکیم حاذق لے کر حاضر ہوا۔ مگر حضرت نے علاج کرانے کی بجائے شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

"عشق کے دردمند کا علاج محبوب کے دیدار کے سوا کچھ بھی نہیں"

اس طرح حق و صدق، فقر، استغنا، علم و عمل کا پیکر، نام و نمود و حبِ جاہ و شہرت سے بے نیاز ولیٔ کامل اپنے ان پسندیدہ خصائل و فضائل کے تابندہ نقوش چھوڑ کر جن کا گہرا رنگ حضرت علامہ اقبال کی شخصیت و صفات میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس جہانِ فانی سے عالمِ دوامی کو سفر کر گیا تاہم ان کا روضہ اسی لاہور کی سرزمین میں واقع ہے جو حاضرین خاص و عام کے لیے آج بھی چشمِ بصیرت کا سرمہ بنتا ہے۔

حضرت میاں میر کی خدمت میں اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار اسرار و رموز میں اس طرح پیش فرمایا ہے:

حضرت شیخ میاں میر ولی   ہر خفی از نور جاں او جلی

مدینۃ الاولیاء، ص ۱۳۳۔

بر طریقِ مصطفیٰ محکم ہے نغمۂ عشق و محبت را نئے
ترجمانِ اسرار خاکِ شہر کا مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما

حضرت میاں میر کے ذکر اوصافِ عالیہ کی مناسبت سے حضرت علامہ اقبال کا مقام بھی
کسی ولی اللہ سے کم نہیں ہو غالب نے اپنے بارے میں کہا تھا:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
ہم تجھے ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر اقبال عام طرح بادہ خوار نہ تھے۔ بلکہ وہ ملتِ مسلمہ اور عالمِ انسانیت کی سر
بلندی و توقیر کے لیے خداوند کی ذات سے سرشار اور کی کشش سے بے نیاز تمام عمر
ایک اعلیٰ و عظیم مقصد کے حصول میں مسلسل اپنے خونِ جگر کی تمام توانائی صرف کر کے قوم کے
لیے اپنی جان نچھاور کر گئے وہ عمر بھر انتہا ہوئے گئے جس کا ثمر قیامِ پاکستان تک جاتا
ہے۔ اگر ان میں وہ جو بصیرت علمی عمرِ جدید اور قرآنی استغنا درویشی جیسے
جوہر نہ ہوتے تو ان یہ نعمت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بے نیازی اور خود
آگاہی کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا ①

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم ②

واقعی ان کی فقیری میں شاہی کی شان تھی۔ ان کی ذات اکتسابی علوم کا مخزن تھی
جسے انھوں نے کبھی ذاتی منفعت اور شہرت کے لیے استعمال نہ کیا۔ وہ بلکہ وہ قدرت کے راز
تھے۔ جو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ رموزِ درون سے خانہ اور حکیم الامت تھے۔ محض
بلند پایہ شاعر و فلسفی نہ تھے۔ وہ قدرت کے سربستہ رازوں سے آگاہ تھے۔ جسے بیان کرنے کے

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۲۴۔
② ایضاً، ص ۳۲۵۔

لیے نفس جبریل کار ہے۔ وہ پردۂ افلاک کے پوشیدہ حادثات کا عکس اپنے آئینۂ ادراک میں محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی خودآگاہی سے امت پر خودی کا راز آشکار کیا۔ جو راز کن فکان بھی ہے اور ... کا ترجمان بھی۔ وہ نغمۂ جبریل بھی تھے اور صور اسرافیل بھی۔ وہ کتاب اللہ کے حکیمانہ ارشادات کو مکمل طور پر سمجھتے اور لعینہ اپنے کلام میں دوسروں کو ابلاغ کرتے۔

وہ صاحب صدق و یقین، حامل خلق عظیم ایسے درویش تھے جن کو حق تعالیٰ نے انداز خسروانہ عطا کیے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہہ ناز کے کرم سے اقبال کی عقل کو غیاب و جستجو یعنی حکیمانہ اور جذب عشق کو درد و سوز و حضور یعنی کلیمانہ نعمتیں میسر تھیں۔

... کا کلام محض شاعری نہیں بلکہ جزو پیغمبری ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

عظیم بزرگ مولانا شاعر گرامی نے جو اقبال کو ہمیشہ مجدد عصر کہہ کر بلاتے ایسے ہی نہیں کہا تھا:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب اوصاف و خصائل اس حقیقت کا واضح ثبوت نہیں کہ دنیاوی مصلحتوں، ذاتی اغراض، سہل انگاری، کوتاہ اندیشی میں مسلم قوم نے ارادتاً اقبال سے مجرمانہ غفلت برتی ورنہ ان کے پیام سروش میں ہمارے لیے تمام مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے۔

مگر اقبال مسلمانوں کے دوبارہ حصولِ عظمتِ رفتہ سے ناامید نہیں۔ اور ایک درخشاں صبح کی نوید دیتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے[1]

---

(1) ایضاً ص ۱۹۵۔

حسین بن منصور حلاج اور علامہ اقبال

حسین بن منصور حلاج کو نعرہ اناالحق بلند کرنے کے باعث کفر کا مرتکب سمجھا گیا اور اہلِ اقتدار اور مخالفین کے فیصلہ کے تحت نہایت اذیت کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ تاہم اس معاملہ میں وہ کافی متنازعہ شخصیت کا حامل تھا۔ کیونکہ بہت سے اصحاب علم و فضل اُسے حق بجانب سمجھتے تھے اور اس کے قتل کو غلط قرار دیتے تھے۔ زیرِ قلم مضمون میں اس معاملے کو ذرا وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔

حسین بن منصور ۸۵۷ء میں شیراز کے نزدیک مقام طور پیدا ہوا۔ والد پیشے کے اعتبار سے پارچہ باف تھا۔ مگر حسین حلاج کے طور پر مشہور ہو کہ ایک دفعہ وہ کسی دھنیے کے پاس کسی کام کے لیے گیا۔ دھنیے دوکاندار نے مصروفیت کی مجبوری بتائی۔ منصور نے کہا تم میرا کام کر آؤ۔ تمہاری غیر موجودگی میں میں تمہاری روئی سے بنولے نکال دوں گا۔ جب وہ لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ ساری روئی دھنی ہوئی تھی۔ دھنیے نے حیران ہو کر کہا کہ تم جادوگر ہو۔ منصور نے جواب دیا کہ یہ جادو نہیں میں تو اس کوشش میں ہوں کہ جس طرح روئی اور بنولے الگ ہو گئے ہیں۔ میں اپنی ذات سے بھی دوئی کو الگ کر دوں۔ دوکاندار نے کہا تم واقعی حلاج ہو اور اس کے بعد منصور کو حلاج کہا جانے لگا۔ (۱)

والد آبائی مقام کو چھوڑ کر تستر کے مقام پر آ کر سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ تو حسین بن منصور کو وہاں مقامی درسگاہ میں داخل کرا دیا۔ جہاں قرآن مجید حفظ کیا۔ مگر ہم سبقوں اور اُستاد سے اکثر جھگڑا رہتا۔ جو اس کے پیچیدہ سوالات کا جواب نہ دے سکتے۔ حلاج نے درسگاہ کو خیر باد کہا اور وہیں سہیل بن عبداللہ تستری کی درسگاہ میں چلا گیا جو پیر طریقت تھے اور علماء میں بلند مقام رکھتے تھے اس زمانے میں علم حدیث، فقہ، تفسیر ادبیات، تاریخ، تصوف، علم الکلام اور

---

(۱) ڈاکٹر شاہد مختار، تذکرہ حسین منصور حلاج، شاہد پبلیکیشنز، ملتان روڈ لاہور۔ ص ۱۳-۱۵۔

فلسفہ کا دور دورہ تھا۔ حلاج کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ مدرسہ میں چلا گیا اس وقت اُس کی عمر ۲۰ برس تھی۔ سہیل تستری کے مدرسہ میں حلاج کا اپنا گوشہ، اپنی دنیا اور اپنا جہان تھا۔ وہ عالمِ استغراق میں ایسی باتیں کہہ دیتا جو شریعتِ ظاہرہ کے منافی ہوتیں اور سہیل تستری کے دل پر گراں گزرتیں۔ وہ حلاج کے اندر چھپی ہوئی چنگاری کو دیکھتے تھے جو کسی وقت اُسے بھسم کر سکتی تھی۔ انھوں نے حلاج کے والد سے شکایتاً کہا کہ حسین کی رفتار بہت تیز ہے وہ ضرورت سے زیادہ مضطرب، اشواقِ جدید میں مبتلا اور بڑے عزائم رکھتا ہے۔ اگر وہ شرع کے اندر رہے تو ٹھیک ہے ورنہ شوریدہ سر آدمی کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

سہیل تستری نے ایک دن حلاج کو خلوت میں سمجھایا کہ راز کی باتوں کا برسرِ عام کہنا جائز نہیں۔ وہ راز جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر منکشف کرتا ہے وہ عام لوگوں پر عیاں نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ جو تم کر رہے ہو یہ ایک طرح انا پسندی اور کم ہمتی ہے۔ حسین نے جواب دیا کہ پیرو مرشد مجھ سے جو بھی فعل سرزد ہوتا ہے اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہوتا نہ اختیار ہے۔ سہل تستری نے کہا معلوم ہوتا ہے تم جبریہ مسلک سے تعلق رکھتے ہو؟ حلاج بولا کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ جو میرے دل پر گزرتی ہے وہ میں راز رکھوں۔ میرا یہ فعل پروردگارِ عالم کی خواہش کے عین مطابق ہے جو مجھے رازوں کے انکشاف میں شریک کرتا ہے وہ خود نہیں چاہتا کہ اس کا راز راز رہے۔ اگر وہ چاہتا کہ اُس کے راز عام نہ ہوں تو وہ جہاں مجھے ان سے واقف کرتا ہے وہاں مجھے اس بات کا حوصلہ بھی دیتا کہ ان کو سینے میں دبائے رکھوں۔ وہ تو عالم الغیب ہے۔ اسے ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوتا ہے اور کس کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ سہیل تستری نے کہا اے حسین مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ تمھاری گستاخانہ گفتگو سہہ سکوں۔ خدا تم پر رحم کرے۔ اس گفتگو سے دلبرداشتہ اور بے چینیِ طبیعت سے مجبور ہو کر حلاج مدرسہ چھوڑ کر عازمِ بصرہ ہوا۔ (۱) جو جملہ علوم کی ایک چھاؤنی کا مقام رکھتا تھا۔ جہاں وہ حسن بصری کے مدرسہ میں داخل ہو گیا مگر بصرہ میں ایسی جماعت سے رابطہ ہو گیا جو سیاسی طور پر حکومتِ وقت کے معتوب تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے حلاج کو بصرہ چھوڑنا پڑا۔ (۲)

---

(۱) ایضاً مکتب سہیل تستری میں داخلہ وعلیحدگی، ص ۱۸-۱۹۔

(۲) ایضاً حسن بصری کے پاس آمد ورخصتی، ص ۱۹۔

حلاج بصرہ چھوڑ کر بغداد میں عمرو بن عثمان المکی کے سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہوا اور خرقۂ تصوف حاصل کیا۔ عمرو عثمان نے حلاج سے پوچھا کہ سہیل بن عبداللہ تستری کی خانقاہ میں کیا کمی تھی جو ہمارے پاس چلے آئے ہو۔ حلاج نے جواب دیا کہ وہ نہایت مصلحت اندیش ہیں۔ عمرو عثمان نے کہا کہ تمھیں اصلاح کے لیے تہذیبِ نفس کی ضرورت ہے۔ جب تک تم راہِ شوق اور سیر اللہ کے لیے خود کو تیار نہ کرو گے۔ یہاں آنا تمھیں کوئی نفع نہ دے گا۔ تمھاری بے قراری اور جو آگ تمھارے اندر بھڑک رہی ہے ایک دن تم اسی آگ میں جل مرو گے۔ انھوں نے حلاج کو سمجھاتے ہوئے کہا اگر حاکمِ وقت تمھیں کوئی قیمتی راز بتاتے ہوئے کہے کہ اسے افشا نہ کرنا۔ ورنہ کڑی سزا جو موت ہو سکتی ہے دی جائے گی تو پھر بھی تم راز کو سینے میں نہیں رکھو گے؟ حلاج نے جواب دیا کہ اگر وہ راز حاکم وقت مجھ پر عیاں کرتا ہے واقعی اس قدر پوشیدہ ہے تو پہلی غلطی حاکم وقت کی ہے جس نے مجھے رازداں بنایا۔ جس راز کو وہ خود اپنے سینے میں نہیں رکھ سکا تو وہ مجھ سے کیسے توقع کر سکتا ہے کہ میں اُسے سینے میں چھپاؤں جہاں تک سزا کا سوال ہے تو میرا سر ہر وقت زیرِ شمشیر رہتا ہے۔ اس صورت میں میرا جرم یہی ہوگا جو حاکمِ وقت سے ہو چکا ہے۔ اس پر عمرو عثمان نے کہا تمھاری باتوں میں تمھارے لہو کا رنگ جھلکتا ہے کیونکہ تم گمراہ ہو چکے ہو۔ ①

نتیجتاً حلاج نے عمرو عثمان المکی سے مراجعت کی اور اپنے سسر یعقوب الاقطع کے مشورے سے حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں جا پہنچا۔ تاریخ تصوف میں حضرت جنید کو بہت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ وہ مشہور صوفی سری سقطی کے بھانجے تھے۔ حضرت جنید کو سید الطائفہ، لسان القوم، طاؤسِ علماء، سلطانِ محققین جیسے الفاظ سے تعظیم حاصل تھی۔ آپ مدرسہ نظامیہ کے استادِ اعلیٰ، عالمِ بے بدل اور بغداد کے روحِ رواں تھے۔ انھیں علم کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ حضرت جنید نے حلاج کو سمجھایا کہ تم میں انا کا زیادہ ہی زعم ہے تم حسنِ صحبت کے تقاضوں کا علم نہیں رکھتے پہلے تم نے سہیل تستری کو چھوڑا۔ حسن بصری کے پاس نہ ٹھہر سکے۔ پھر عمرو عثمان المکی کو ناراض کیا۔ اب تم میرے پاس آ کر ویسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ دعوے کر رہے ہو اور غلط نظریے رکھتے ہو۔ لہٰذا تم واپس سہیل تستری کے پاس چلے جاؤ جو تم پر توجہ کر سکتے

---

① ایضاً، عمرو بن عثمان المکی سے بحث و الوداع، ص ۲۰-۲۲۔

ہیں۔ غرضیکہ حضرت جنید نے حلاج کو قبول نہ کیا کیونکہ وہ خود کو مرشد سمجھتے ہوئے کسی کو اپنا مرشد نہیں سمجھتا تھا۔ حضرت جنید نے حلاج کے رویے پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے تختہ دار پر انجام کی پیش گوئی کی۔ ①

۸۸۵ء میں حلاج نے فریضۂ حج ادا کیا۔ قیام کے دوران تمام عرصہ کڑی دھوپ میں عبادت و ریاضت میں وقت گزارتا۔ اور چار لقمے روٹی اور چار گھونٹ پانی پر گزارا کرتا اور نماز کے وقت کے علاوہ اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ اس قدر کٹھن عبادت و ریاضت کرتے دیکھ کر کسی اہلِ نظر نے کہا کہ یہ ضرور خود کو کسی بڑی آزمائش میں اُلجھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح نفس کشی کر کے میں بڑی بہادری دکھا رہا ہوں۔ ②

حج ادا کرنے کے بعد حلاج تستر چلا گیا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ جس کا مقصد اپنے اندر حق تعالیٰ کو تلاش کرنا تھا۔ اس دوران میں وہ اپنی کرامات کے سبب بہت مشہور ہو گیا۔ مٹھی بھر سائز کا انگور، دو بالشت گولائی کا سیب پیش کرتا، بازو بلند کرتا تو ہاتھ درہموں سے بھرا ہوتا۔ سردی میں گرمیوں اور گرمی میں سردیوں کے پھل حاضر کرتا، سانپ کو کوڑا بناتا ہر دروازے کے قفل کو چابی کے بغیر کھولتا، آتش کدے میں جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی آگ کبھی نہیں بجھتی اس کو بجھایا اور دوبارہ روشن کر دیا۔

حلاج نے بہت سیاحت کی، چین تک سفر کیا۔ مختلف علاقوں میں بہت ہمنوا، معتقدین اور پیروکار پیدا ہوئے۔ تاہم مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں تھی جو اسے جادوگر، شعبدہ باز، جاہل، گمراہ، متکبر قرار دیتے۔ حلاج کو امام ربانی بھی کہا گیا ہے وہ ہاتھ کو حرکت دیتا تو لوگوں پر مشک جھڑنے لگتا، شاخ ہلاتا تو کھجوریں جھڑنے لگتیں یا سکے برسنے لگتے۔ کثرتِ ریاضت و مجاہدہ سے لباس کا مطلقاً خیال نہ ہوتا۔ بڑی بڑی جوؤں اور کیڑوں نے لباس کو مسکن بنا لیا تھا۔ خوراک بے حد کم تھی بکثرت نمازیں اور نوافل پڑھتا۔ ہمیشہ روزے رکھتا، موافق و ہمنوا صوفیا لوگ اُسے شیخ صالح اور امام ربانی کہتے۔ بقول حلاج جو شخص اطاعتِ الٰہی میں جسم کو پاک رکھے جسم و قلب کو

---

① ایضاً، حضرت جنید بغدادی سے مکالمہ، حلاج کے رویے پر دار پر لٹکانے جانے کی پیش گوئی، ص ۲۵۔
② ایضاً، ادائیگی حج میں کٹھن ترین ریاضت کا مظاہرہ، ص ۲۷۔

نیک اعمال میں مشغول رکھے لذاتِ دنیوی سے کنارہ کش ہو۔ نفس کی خواہشات سے پاک رکھے، پھر صفائی قلب اور تزکیۂ نفس کے نتیجہ میں اس کی ہستی بشریت سے پاک ہو جاتی ہے۔ تب خدا کی روح اُس میں حلول کر جاتی ہے ہر چیز اس کے تابع ہو جاتی ہے۔ اس کے افعال خدا کے افعال ہوتے ہیں۔ حلاج لوگوں سے کہتا کہ اُسے یہ درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

لوگوں نے یہ بات وزیر مملکت حامد عباس کو بتائی کہ یہ شخص گمراہ ہو گیا ہے۔ جادو شعبدے دکھا کر معجزات کا دعویٰ کرتا ہے۔ خدائی کا دعویٰ کرتا اور کہتا ہے کہ گھر بیٹھے حج ہو سکتا ہے۔ وزیر نے تحقیقات کرائی تو کئی منسوب شدہ الزامات درست پائے۔ چنانچہ حلاج کو قید کر دیا گیا۔ ①

شیخ ابن عطار کا شمار بہت بڑے صوفیوں میں ہوتا ہے وہ حلاج کو حق پر سمجھتے تھے اور حلاج کی اسیری کے دوران اس سے ملنے جاتے تا کہ حلاج سے ان کی تحریریں اقوال حاصل کر کے محفوظ کر لی جائیں۔ حلاج کو قید کے دوران انھوں نے عوام میں بڑی جرات اور جواں مردی سے ان کی طرف داری کی۔ بس پر حکومت وقت کے کارندوں نے انھیں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ ②

شیخ ابو بکر اسحاق نے حلاج کو شب بیدار عبادت گزار قائم اللیل کہا اور دنیاوی خواہشات سے مستغنی لکھا ہے۔ حلاج کو جب حضرت جنید سے اپنے مسائل کا تسلی بخش جواب نہ ملا تو وہ آشفتہ و غمگین ہوئے اور واپس تستر چلے گئے جہاں وہ وعظ و خطاب سے مخلوق کو اسرار خداوندی بتاتے رہتے اور لوگوں نے انھیں حلاج الاسرار کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

ابن منصور حلاج کے عقائد و نظریات کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جا سکتا ہے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں حلاج کی ۴۶ کتابوں کا ذکر کیا ہے اور سب کے ناموں کی تفصیل دی ہے۔ اسماعیل پاشا نے بھی انھی کتب کی تصدیق کی ہے۔ البتہ اپنی فہرست میں ایک اور کتاب الجہیم الاصغر و الجہیم الاکبر کا بھی ذکر کیا ہے جو ابن ندیم کی فہرست میں نہیں۔ ان تصانیف سے حلاج کے صاحب علم و دانش ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ جسے مخالفین جاہل و گمراہ کے الفاظ سے اپنی ذاتی تعصب کو تسکین بہم پہنچاتے تھے۔ اب یہاں حلاج کے

---

① ایضاً کرامات کا اظہار اور انا الحق کی صدا اور قید ہونا، ص ۳۵-۳۸۔

② ایضاً شیخ ابن عطار کا حلاج کی حمایت پر اہلکاروں کے ساتھ مارا جانا، ص ۳۶۔

نعرۂ انا الحق کا جائزہ لیا جاتا ہے جو دراصل اُس کے خلاف ساری مہم کی جڑ ہے۔ ①

انا الحق کا جملہ ابن منصور کی مشہور تصنیف کتاب الطواسین میں مرقوم ہے۔ جس کی دریافت کا سہرا فرانس کے شہرۂ آفاق مستشرق لوئی ماسینوں کے سر ہے۔ جس نے اپنی زندگی کے ۵۵ سال اس متنازعہ فیہ لیکن فکری اعتبار سے انتہائی بااثر صوفی اور شخصیت کی سوانح حیات اور اس کے نظریات کی تحقیق میں صرف کر دیے۔ جس کی تحقیق کے نتیجہ میں حلاج کے بارے میں نیم تاریخی، غیر مصدقہ افسانوی واقعات و روایات و متضاد بیانات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے اور اس کی بجائے عالمانہ سطح پر اس کے نظریات کا مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اور علامہ اقبال جیسی معتبر ہستی کے خیالات میں یکسر تبدیلی رونما ہوئی۔ ②

طواسین، قرآنی حروف مقطعات، طٰسین کا مجموعہ ہے۔ اس کا مفہوم لفظ سجدہ کے گرد پھیلا ہوا ہے۔ یہ کتاب عربی میں گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جو حلاج کی فکری سرگذشت ہے۔ جس میں وہ عقائد اور فکری و منطقی استدلال سے پیدا ہونے والی کشمکش کو زیر بحث لاتا ہے اور استدلالی ڈھانچے کو عقل کے ذریعے ناقابل اعتماد قرار دیتا ہے۔ اس کتاب کا محوری نقطہ نبی کریم ﷺ کی ذات پاک، واقعہ معراج اور حقیقتِ نورِ محمدیہ ہے۔

حلاج کے نزدیک الوہی حقائق کا ادراک مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ مشاہدۂ تجلی ذات کے اصلی مقام پر آنحضرت ﷺ کے سوا کوئی شخص فائز نہیں ہو سکا۔ معراج کا واقعہ آپ ﷺ کے بلندیٔ مقام کی خبر دیتا ہے۔

---

① ایضاً، ابن ندیم نے الفہرست میں حلاج کی ۴۶ کتابوں کے نام درج کیے جن میں اسماعیل پاشا نے دو اور کتب الجہیم الاصغر، الجہیم الاکبر کا اضافہ کیا۔ ص ۱۰۷-۱۰۸۔

② ایضاً، حلاج کی اصل دریافت فرانسیسی مستشرق موسیٰ ماسی نیون نے اس کی کتاب الطواسین کا مسودہ برٹش میوزم سے حاصل کر کے طویل تحقیق کے بعد مصدقہ متن ترتیب دیا۔ جس کے بغور مطالعہ کے بعد اقبال بھی جو پہلے حلاج کی سزا کو درست سمجھتے تھے۔ اپنی رائے بدل کر نہ صرف اُسے بے گناہ قرار دیا۔ بلکہ اس کی حق گوئی اور استقامت کے معترف ہو گئے اور حلاج کی زبانی اپنے بارے میں بتایا کہ میں بھی حلاج کی طرح حق گوئی کے راستے پر چل رہا ہوں۔ کہیں نافہم اور کم تجہہ معترضین میرا بھی حلاج جیسا حشر نہ کریں، ص ۱۱۶-۱۱۷۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر تجلیٔ ذات کا موقع ملا مگر وہ بھی صاحب خبر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مقابلہ میں صاحب نظر ہیں۔ اس کے بعد منصور حلاج آتا ہے کہ میری مثال بھی ایسی ہی ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے درخت سے انا اللہ کی آواز آئے تو کوئی حرج نہیں اور مجھ میں انا الحق کی صدا بلند ہو تو انکار اور مواخذہ! آخر کیوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ درخت سے سنا وہ درخت کی آواز نہیں تھی۔ بلکہ خود حق تعالیٰ کی آواز تھی۔ اس لیے جو کچھ میں کہتا ہوں اسے میرا کلام نہ سمجھنا چاہیے۔ ایک درخت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا مخزن بن جائے تو عجب نہیں اور ایک ایسا انسان جو اشرف المخلوقات ہے اگر وہ الٰہی تجلی کا مرکز ہو جائے تو تعجب کیوں ہو؟[1]

کتاب کے ایک باب میں حلاج نے بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ سے وصال اسی صورت میں ممکن ہے جب اپنی ذات کو فنا کر دیا جائے۔ اس کو راہ سلوک کہا جاتا ہے۔ پہلے درجے میں انسان عالم ناسوت میں ہوتا ہے۔ دوسرا عالم ملکوت سے تعبیر کیا گیا ہے جسے عالم ارواح اور عالم غیب بھی کہتے ہیں۔ تیسرا مقام عالم جبروت ہے جسے حقیقتِ محمدیہ و مرتبۂ احدیت سے نسبت دی گئی ہے۔ یہ صفات الٰہی کی عظمت و جلال کا مقام ہے یہ مرتبہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے اور سب سے آخر مقام لاہوت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تینوں درجات سے گزر کر مقام لاہوت پہنچ گئے اور جو قرب خداوندی آپ کو نصیب ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ لیکن اگر کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کاملہ اور عشق حقیقی رکھتا اور آپ کی شریعت و سنت کا پوری طرح پابند ہو تو ایسے شخص کے لیے بعید نہیں کہ اُسے اعلیٰ مقام کی فضیلت سے حصہ نہ ملے۔

یہاں حلاج موسیٰ علیہ السلام، ابلیس اور فرعون کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ابلیس مقام ذات کا سب سے بڑا راز دانِ راز ہے۔ اُس نے اپنے اُس مکالمے کو قلمبند کیا ہے جو اُس کا عالم خیال میں ابلیس اور فرعون کے ساتھ استقامت و ثابت قدمی کے بارے میں ہوا۔ ابلیس نے کہا

---

[1] ایضاً، حلاج اپنی کم بے بصری پر معترض ہے۔ کہ طور پر درخت سے آتی ہوئی آواز کو تو حق تعالیٰ کی آواز قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک اشرف المخلوقات انسان کے انا الحق کو میرا گناہ قرار دے کر دار پر لٹکانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ یہ اللہ ہی کی صدا ہے۔ میری نہیں۔ ص ۵۳-۱۱۹۔

اگر میں آدم کو سجدہ کرتا تو استقامت اور ثابت قدمی کے مقام سے گر جاتا۔ فرعون نے کہا اگر میں موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لے آتا تو میں بھی وقار اور مردانگی کے مقام سے گر جاتا۔ اس پر حلاج نے کہا کہ میں بھی اپنے قول انا الحق سے باز آ جاؤں تو مقام عزت و وقار سے دور جا پڑوں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ابلیس و فرعون جو دونوں مردود ہیں اتنے ثابت قدم ہوں اور میں جو حق پر ہوں اور حق تعالیٰ کا ایک پرتو ہوں اور اپنے دعویٰ انا الحق سے دست بردار ہو جاؤں۔ اس لیے کہوں گا کہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی میں ابلیس اور فرعون میرے اُستاد ہیں۔ ابلیس نے سجدہ سے انکار کر کے اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی اور یکتائی کو قائم رکھا اور آدم کو سجدہ نہ کر کے کسی غیر کو اُس کا شریک نہ ٹھہرایا۔① گویا بقول غالب:

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے

پروفیسر نکلسن لکھتا ہے کہ حلاج نے دو لفظوں میں انا الحق کا ایسا جملہ زبان سے ادا کیا ہے جسے اسلام نے معاف کر دیا لیکن [illegible] موت نہیں کیا یہ ایک ایسا وجدانی اور روحانی فارمولا تھا جس پر صوفیانہ دبستان کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ [illegible] نے انا الحق کہنے والوں کو اس لوہے سے تشبیہ دی ہے جسے آگ میں ڈالا جائے اور اس کا رنگ آگ کی مانند ہو جائے۔ رومی کہتا ہے کہ بعض کے نزدیک حلاج انا الحق کہہ کر شرع سے آگے نکل گیا ہے مگر اہل [illegible] نے اُسے خلافِ شرع نہیں سمجھا۔ کیونکہ حلاج کو انا الحق کی ماہیت کا علم تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے باخبر تھا کہ جو کچھ ہے ذات باری تعالیٰ ہے اور میں بھی [illegible] ذات باری تعالیٰ کی [illegible] سے منور ہوں۔

ابن عربی نے بھی انا الحق کی تشریح نظریہ وحدت الوجود کی [illegible] میں کی ہے۔

حلاج کی طرح حضرت بایزید بسطامی کا قول سبحانی ما اعظم [illegible] اور [illegible] کا قول انا الحق سے بھی وحدت الوجود کا نظریہ ثابت کرنا قرین قیاس ہے۔

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ حلاج کا نعرہ انا الحق یہ معنی رکھتا ہے کہ کائنات میں اصل وجود حق ہے اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ہلاک ہونے والا یعنی عدم ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ حالت جذب و مستی کے عالم میں ماورائے عقل حقائق کا ادراک اتنا

---

① ایضاً، خدا تعالیٰ کے حکم پر آدم کو سجدہ نہ کرنے پر ابلیس کی [illegible] خواہی، ص۔

یقینی ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ہاتھ سے کسی چیز کو چھو کر اس کے وجود کو حقیقی سمجھتا ہے۔

بایزید بسطامی مزید کہتے ہیں کہ عرش مَیں ہوں، کرسی مَیں ہوں، لوح و قلم مَیں ہوں، جبرئیل و میکائیل و اسرافیل مَیں ہوں، جو شخص حق تعالیٰ میں محو ہو جاتا ہے وہ حق بن جاتا ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
(غالب)

حضرت مجدد الف ثانی لکھتے ہیں کہ بعض مشائخ کے اقوال جو بظاہر شریعت کے مخالف ہوتے ہیں۔ بعض لوگ انھیں توحیدِ وجودی پر محمول کرتے ہیں جیسے حلاج کا نعرہ انا الحق اور بایزید کا سبحانی کہنا۔ چونکہ غلبہ حال میں ماسوئ حق تعالیٰ کے ہر شے ان کی نظر سے پوشیدہ تھی تو ایسے الفاظ صادر ہو گئے۔ انا الحق کا معنی ہے کہ حق ہے۔ مَیں نہیں ہوں، حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ حلاج سرمستان بادۂ وحدت اور مشتاقانِ جمال احدیّت تھے اور اپنے حال میں اس قدر مغلوب ہو جاتے تھے کہ ان میں استقامت باقی نہیں رہتی تھی اور ایسے صوفیاء کی اتباع نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم وہ حلاج کی عزت اور عظمت کے قائل تھے اور اُن کی سزا کے خلاف تھے۔ ①

اب دیکھیں علامہ اقبال کیا فرماتے ہیں۔ پہلے پہل اقبال بھی حلاج کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے مگر جب انھوں نے ان کی کتاب الطواسین کا مطالعہ کیا جس کا مرکز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ شیفتگی و وابستگی ہے تو ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ پھر انھوں نے دیکھا ہوگا کہ اُن کے مرشد معنوی مولانا روم بھی حلاج کو پسند کرتے ہیں تو ان کی عقیدت اور بڑھ گئی چنانچہ وہ کتاب الطواسین کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

حلاج کے انا الحق نے تصوف کی دنیا میں حشر برپا کر دیا۔ اُس نے برملا کہا مجھے مار ڈالا جائے، میرے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں، مَیں اپنے قول انا الحق سے باز نہیں آؤں گا اور واقعتاً اُسے تختہ دار پر چڑھایا گیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے مگر وہ انا الحق کہنے سے باز

---

① ایضاً، حضرت داتا صاحب حلاج کو سرمستان بادہ وحدت اور مشتاق جمال احدیت کہتے ہیں جو بموجب کشف المحجوب ترجمہ ابوالحسنات محمد احمد قادری سے ہے، ص ۳۰۸۔

نہ آیا۔ اس نے انا الحق کے معانی بیان کیے۔ مگر لوگ اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے اور اُس کے خلاف موت کا فتویٰ دے دیا گیا۔ مگر صاحب نظر بزرگانِ دین نے اُسے خراج عقیدت پیش کیا۔ جیسا کہ بیان کر دیا گیا ہے۔

تو اب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حلاج نے "انا" کو خدا کے متشابہ قرار دیا ہے۔ خدا نہیں کہا حلاج کہتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی انا کے مفہوم کو جانتے ہیں۔ انسانیت کی معراج بھی وہی تھے۔ وہ جب حقیقت کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچے تو قرآن حکیم کے مطابق ان میں دو قوسوں سے بھی کم فاصلہ تھا۔ حلاج نے اس آیت کا بار بار حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلند ترین مدارج پر ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ سے الگ رہے ان میں استقامت تھی۔ وہ صابر و شاکر تھے، بھلا وہ انا الحق سے مَیں خدا کیسے کہہ سکتے تھے۔ بلکہ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ محبت کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ تو دلدار کے پہلو میں کھڑا رہے۔ اپنے اوصاف ترک کر دے اور حق کی صفات سے متصف ہو جائے۔ گویا خالق و مخلوق کو ایک دوسرے سے جدا سمجھتے ہیں کہ حق ہمیشہ حق رہے اور مخلوق مخلوق۔

علامہ اقبال بھی انسان کو خدا کا حصہ قرار دیتے ہیں مگر اُسے خدا نہیں کہتے۔ مثلاً:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز ①

ان تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی کہے حلاج نے خدائی کا دعویٰ کیا تو اُسے جہالت کے سوا کیا کہیں گے اور محض ضد اور جھوٹی اَنا کے تحت حلاج کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔

خیال آتا ہے کہ حلاج جیسا شخص جو حد درجہ عبادت گزار، ریاضت و مجاہدے میں مستغرق، مستقل روزہ دار، دن رات میں دو دفعہ چند نوالے روٹی اور چند گھونٹ پانی پر زندہ رہنے والا اور نفیس لباس و جسمانی و نفسانی خواہشات سے مستغنی ہو۔ آخر اس کی اتنی عبادت و ریاضت و نفس

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۸۹۔

کشش عشقِ الٰہی کے لیے نہیں تھی تو کس کے لیے تھی؟ ایسا شخص جو دن رات اللہ تعالیٰ کے حضور قیام و جود میں رہتے ہوئے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں معدوم جان کر "انا الحق" پکار اٹھے۔ گویا صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقت ہے ماسوا کچھ نہیں ہے تو اُس پر خدائی کا دعویٰ کرنے کا الزام لگا کر ہلاک کرنا کہاں تک حق بجانب ہے؟ اس کی عبادت تو احسان کی تعریف میں آتی ہے گویا:

اصل نماز ہے یہی ، روحِ نماز ہے یہی
میں تیرے روبرو رہوں، تو میرے روبرو رہے

تو ظاہر ہے ہوا کہ حلاج کو ہلاک کرنے والے برسرِ اقتدار دشمن طبقے اور گروہ مخالفین میں اُس کی بے باک گفتگو کی تاب لانے کا حوصلہ نہ تھا۔ کیونکہ سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے۔ اور چونکہ حلاج بھی نعرۂ انا الحق بلند کرنے پر قائم رہا اور ہلاکت سے بالکل خائف نہ ہوا تو انجام تو یہی ہونا تھا کہ "کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن۔ کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی"۔ اس ضمن میں اقبال کہتے ہیں:

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں ①

یعنی اقبال نے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے خیال و نظر کی مجذوبی یعنی جذبۂ عشق کے تحت دیوانہ وار جدوجہد، عمل پیہم کو لازمی قرار دیا ہے۔ مگر اس طوفان آفرین میں توازنِ استقامت اور جوش کے ساتھ ہوش ضروری ہے۔ جس سے حلاج ارادتاً بے نیاز رہا۔ لہٰذا وہ ناراض معاشرے اور کرگسوں کے انتقام کا شکار ہو گیا۔

اقبال خود بھی مذہبی تقلید پسند ٹھیکیداروں کی تنگ نظری کا شکار ہوا۔ اس کے کلام اور اسرارِ خودی کی وجہ سے کفر کے فتوے لگے اور اگر اس کے دکن میں دیئے گئے انگریزی کی اعلیٰ انشاء پردازی میں دانشورانہ اور مجتہدانہ لیکچر اُن کی سمجھ میں آ جاتے تو ممکن ہے اقبال کو بھی منصورِ ثانی بنا دیا جاتا۔

بہرکیف تقلید پر مُصر رجعت پسند علما نے اپنی تنگ نظری اور کم علمی کی وجہ سے اسلام کی

---

① ایضاً، ص ۳۱۹۔

ارتقائی حیثیت کبھی قبول نہیں کی۔ بلکہ زمانے کے جدید تقاضوں کے خلاف اپنی طرزِ کہن پر اڑتے ہوئے مطلق العنان، جابر اور عیش پرست حکمرانوں کے جامد و ساکت اور کوتاہ اندیش رویوں کو خوف یا طمع زر کے تحت اپنے فتووں سے تحفظ دے کر اسلامی دنیا کے لیے زمانے کے حالات کے مطابق ترقی کرنے کے راستے مسدود کر دیے۔ نتیجہ سب کے سامنے کہ اللہ تعالیٰ کے غالب دین کے عالم اسلام میں پیروکارانِ تقلید اور رجعت پسند عناصر کی وجہ سے بے علمی، بے عملی کے ہاتھوں آج مغلوب و مقہور، غلامی، ذلت اور پس ماندگی میں مبتلا ہیں اور نجات کے لیے کسی مردِ غیب کی آمد میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر بیٹھے ہیں۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

اقبال نے الطواسین کا مطالعہ کیا تو ان پر منکشف ہوا کہ حلاج نے فنائے خودی نہیں بلکہ اثباتِ خودی کا درس دیا تھا۔ چنانچہ دیکھتے ہیں کہ اقبال نے جا بجا حلاج کے خیالات سے اتفاق کیا ہے اور انا الحق کی شرح اس طرح کی۔ جو حلاج کا مقصود تھا۔ وہ حلاج کے اور اپنے خیالات میں اس قدر مماثلت پاتے ہیں کہ اپنے آپ پر حلاج کی تشبیہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی حلاج کی طرح ہی رازِ خودی فاش کیا ہے۔ مثلاً:

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
ایک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ ①

اور جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ:

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند
بندۂ حق را بدار آویختند ②

---

① ایضاً، ص ۸۵۰۔

② کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۷۱۰۔

اور جب اقبال حلاج سے پوچھتے ہیں کہ تمھارا گناہ کیا ہے؟ تو کہتا ہے کہ میرا گناہ وہی ہے جو تمھارا ہے لہٰذا تمھیں بھی ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ تمھارے دور میں بھی کم نگاہاں افراد بکثرت موجود ہیں جو نا معلوم تمھارے ساتھ کیا کر گزریں گے؟

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس
محشر بر مردہ آوردی بترس ①

چنانچہ معلوم ہوا کہ علامہ اقبال بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو حلاج نے کیا تھا بلکہ وہ نہ صرف خود انا الحق کہہ رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی کہنے کا پیغام دے رہے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کا "انا الحق" ہستی انسان کو صرف باطل کی طرح مٹانے کی بجائے، قطرے کے اندر دجلہ دکھاتا ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال نے جہاں مشاہیر اسلام کا ذکر نہایت دلپذیر انداز میں کیا ہے۔ وہاں حلاج کو نمایاں خصوصیت حاصل ہے جس کی زبانی علامہ نے بڑے دلکش اشعار کہلوائے ہیں۔ جولازماً حلاج کی کتاب انطواسین کا کرشمہ ہیں۔ حلاج کے متعلق متشرق میسی نیون نے لکھا ہے کہ وہ تقدیر پرستی کا قائل تھا اور انسان کو افعال و اعمال میں مجبور سمجھتا تھا۔ مگر علامہ اقبال کے جبر کے نہیں قدر کے قائل ہیں۔ حلاج کے جبر کی بڑی خوبصورتی سے تعریف کرتے ہیں اور اسے قدر کا ہی ایک رخ قرار دیتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

حلاج

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ
لرزد از نیروے او ابلیس و مرگ
جبر، دینِ مرد صاحب ہمت است
جبر مرداں، از کمالِ قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر
جبر مرد خام را آغوشِ قبر

---

① ایضاً، ص ۱۱۷۔

جبر خالد عالمے برہم زند
جبر ما بیخ وبن ما برکند
کار مرداں است تسلیم و رضا
بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا[1]

یہ وہ جبر ہے جس سے اختیار ملتا ہے۔ یعنی ضبط نفس بذریعہ اطاعت الٰہی۔

می شود از جبر پیدا اختیار

ان اشعار میں انھوں نے حلاج کے نظریہ جبر کا دفاع کیا ہے کہ مرد کامل کے لیے جبر بھی قوت بن جاتا ہے جیسے حضرت خالد بن ولید کے لیے۔ مگر ناپختہ لوگوں کے لیے جبر کا نظریہ موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تسلیم و رضا کا سبق پختہ کار لوگوں کے لیے مناسب ہے۔ کمزوروں اور غلاموں کے لیے نقصان دہ ہے۔ دراصل اقبال کی شاعری مسلمانوں کو ترقی کے مدارج طے کرنے کے لیے رقم کی گئی ہے۔ اہل اسلام کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کے لیے انھوں نے جبر کی بجائے قدر اور خود انحصاری کی راہ کو پسند کیا۔ لیکن اگر کوئی جبر کا قائل بھی کارہائے نمایاں سرانجام دے جیسے حلاج نے جاں کی بازی لگائی تو انھیں اُس کے جبر پر پیار آنے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ مرد مومن کے جبر کو بھی قدر ہی قرار دیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں حلاج، قرۃ العین، طاہرہ اور غالب کو سفر فردوس میں فلک مشتری پر اکٹھے دکھایا ہے۔ ان تینوں کو اقبال نے طبقہ عشاق میں شمار کیا ہے۔ جن کا عقیدہ ہے۔ کے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست۔ عشق کے ان شہسواروں سے اقبال کو بے حد پیار ہے۔ وہ ان سے مختلف سوالات کرتے ہیں۔ جن میں حلاج سے کیے گئے سوالات و جوابات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے ان پاکیزہ ارواح کو جنت میں نہیں دکھایا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو داخلہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ انھوں نے خود ہی جنت میں پابند ہو کر رہنا پسند نہیں کیا اور کائنات میں آزادانہ سیر بینی اور گردش کو ترجیح دی ہے۔ اقبال نے جب حلاج سے پوچھا کہ وہ مومنوں کی جنت سے کیوں دور رہتے ہیں تو وہ جواب دیتا ہے کہ جو شخص نیک و بد کے فلسفہ سے آگاہ ہے

---

[1] کلیات اقبال فارسی، نظم بعنوان حلاج، ص ۷۰۹۔

اُس کی روح جنت میں نہیں سما سکتی۔ وہ مُلا اور آزاد مردوں کی جنت کا فرق بتاتا ہے اور وضاحت کرتا ہے کہ فراق سے عشق کی آگ بھڑکتی ہے اور یہی عشاق کے لیے سازگار ہے۔ اقبال بھی وصال سے زیادہ فراق کے قائل ہیں اور مُلا کی جنت کو پسند نہیں کرتے۔ ① حلاج کی زبانی اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار اشعار میں اس طرح کیا ہے:

مردِ آزادے کہ داند خوب و زشت
می نگنجد روحِ او اندر بہشت
جنتِ مُلا مے و حور و غلام
جنتِ آزادگاں سیرِ دوام
جنتِ مُلا خور و خواب و سُرود
جنتِ عاشق تماشائے وجود
حشرِ مُلا شقِ قبر و بانگِ صور
عشقِ شور انگیز خود صبحِ نشور
ایں دلِ مجبور ۔ ما مجبور نیست
ناوکِ ما از نگاہِ حور نیست
زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است
از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است ②

پھر وہ حلاج سے جنابِ رسالتمآب ﷺ کی عظمت کا راز پوچھتے ہیں۔ کیونکہ اُسے رسولِ اقدس کی ذاتِ پاک سے والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ اور اس کے جواب میں حلاج سے لاجواب شعر کہلوائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدُہٗ فرمودہ است

---

① جاوید نامہ، تحقیق و توضیح از ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ص ۱۲۱-۱۲۲۔
② کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۷۰۴۔

عبدہٗ از فہم تو بالا تر است
ز آنکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار اُو منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست
ما ہمہ رنگیم اُو بے رنگ و بُو ست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست
عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجاست
کس ز سرّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرّ اِلّا اللہ نیست①

جاوید نامہ میں حلاج کی زبان سے عبدہٗ کی تعریف میں جو کہا گیا ہے وہ انھی نادر عشقِ رسالت میں ڈوبے خیالات کی بازگشت ہے جو حلاج نے اپنی کتاب الطواسین میں بیان کیے ہیں۔ لگتا ہے کہ الطواسین کے مطالعہ سے اقبال میں ابلیس کے متعلق خیالات میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے بعد وہ آئندہ اشعار میں رومی کی زبان سے ابلیس کو خواجۂ اہلِ فراق ہی کہتے ہیں۔ ابلیس خدا سے کہتا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر عالم میں تیرا شناسا کہاں ہے؟ مجھے تجھ سے محبت ہے ایسی محبت جو شدید بھی ہے اور قدیمی بھی ہے۔ اب میں تیرے سوا کسی اور کو کیسے سجدہ کروں؟②

---

① ایضاً،ص۱۹۷۔
② ایضاً،ص۲۲۷۔
گفت رومی خواجۂ اہلِ فراق آں سراپا سوز و آں خونیں ایاق

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب
گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہُو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرے کی آبرو فراق[1]

جدائی شوق را روشن بصر کرد
جدائی شوق را جوئندہ تر کرد

بہر کیف ابلیس کے بارے میں اقبال کے تحسین آمیز خیالات کے باوجود وہ اُسے مردود سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے تکبر میں آ کر خدا کی نافرمانی کی اور اُسے تقدیر و مجبوری کا نام دیا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کا آدم کو سجدہ نہ کرنا ایسی مشیت خداوندی تھی۔ مرشد اقبال حضرت رومی کے بقول انکار سجدہ کو مشیت الٰہی کہنے پر عزازیل کو ابلیس کا لقب ملا۔ کہ اس نے اپنے جرم کا الزام اللہ کو دیا (تقدیرِ الٰہی) اور مردود ٹھہرا۔ آدم و حوا نے شجر ممنوعہ کے پاس جانے کو اپنا جرم کہا اور خلافتِ ارضی کے سزاوار ٹھہرے۔ اقبال اسی فکر کا نمائندہ ہے۔ وہ جمادات و نباتات کو تقدیر کا زندانی مگر انسان کو احکام الٰہی کا پابند تسلیم کرتا ہے۔ جس نے آدم کی ابلیس پر فوقیت ظاہر کر کے اُسے دنیا میں بھیج کر رزمگاہ حق و باطل کے لیے تیار کرنا تھا۔ بقول اقبال:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ابلیس کے بارے میں اقبال کے خیالات میں حلاج سے زیادہ وسعت ہے۔ اگرچہ حلاج کے خیالات نے ہی اقبال کے خیالات کو مہمیز لگائی ہے۔

حلاج کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد آخر میں اُس کے دلخراش، عبرتناک انجام کی طرف آتے ہیں۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ حلاج انوکھی اور الگ تھلگ طبیعت و مزاج کا مالک تھا۔ اُس کی فطری ذہانت، فطانت اور احساسِ برتری نے اُسے ہمیشہ بے چین اور سیماب پا رکھا۔ اُس کے ذاتی احساسِ برتری نے اپنے برگزیدہ معلمانِ کرام،

---

[1] کلیاتِ اقبال، اردو، ص ۳۰۶۔

ہمدرسوں، ہم جلیسوں سمیت کسی کے آگے جھکنا یا سمجھوتہ کرنا نہ سیکھا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے اوّلین استاد سہیل تستری، حسن بصری دیگر اصحاب علم وفضل پھر بغداد میں عمرو عثمان المکی اپنے سسر اور حضرت جنید بغدادی اور کسی سے بھی نباہ نہ کر سکا۔ جس کی بنیادی وجہ حلاج کے پیچیدہ، غیر شرعی، اختراعی سوالات ہوتے۔ یا خلاف شرع بیانات۔ مثلاً ایک دوست کو کہا کہ میں قرآن حکیم کا مثل لکھ سکتا ہوں۔ جس پر وہ شخص ناراض ہو کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔① اس طرح حلاج نے عمرو عثمان المکی اور حضرت جنید بغدادی کا الٰہی راز افشا نہ کرنے کی تلقین کو تکرار سے ردّ کر دیا۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی نے پیش گوئی کہ میں تمھیں سولی پر دیکھ رہا ہوں۔ حلاج کی حلقون مزاجی کے پیش نظر غالب نے اُس کے بارے میں ٹھیک کہا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں②

مگر حلاج کا اپنا نظریہ اور رویہ فیض کے شعر کے مطابق اس طرح کا ہے:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اس کے باوجود مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے میں بڑا وزن ہے کہ حلاج شہید شریعت سے زیادہ قتیل سیاست ہے۔ کیونکہ خلیفہ وقت مقتدر باللہ پر لے درجے کا عیاش دن رات عورتوں اور خوبرو لونڈوں میں گھرا رہتا ہے۔ اُس کے درباری، وزیر قاضی، حاجب، سپہ سالار، کارندے بھی کرپٹ، بددیانت، زرپرست، عیاش اور رشوت خور تھے۔ خلافت عباسیہ زوال کی طرف رواں دواں تھی۔ چنانچہ خلیفہ اور اہلکارانِ دربار حلاج کی عوام میں مقبولیت سے خوفزدہ تھے اور اس کی تبلیغی تحریک کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ ان حالات میں اُن کے پاس حلاج کو ہلاک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔③ چنانچہ اُس پر اس طرح کے الزام لگا کر موت کا فتویٰ

---

① ڈاکٹر شاہد مختار، ص ۳۶۔

② دیوان غالب،

③ ڈاکٹر شاہد مختار، ص ۲۰۳-۲۰۸۔

حاصل کیا گیا۔ کہ حلاج:

۱-انا الحق کہہ کر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔

۲-حلول کا قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اُس میں اس طرح حل ہے۔ جس طرح شراب میں صاف پانی۔

۳-حج کو لازم نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ گھر بیٹھے حج ہو سکتا ہے۔

۴-قرامطی فرقے سے تعلق رکھتا ہے (حالانکہ وہ سنی تھا، قرامطی نہیں تھا) جنھوں نے صبح شام صرف دو دو رکعت نمازیں فرض قرار دی ہیں۔ اُس کے علاوہ زکوۃ ختم، غسلِ جنابت غیر ضروری، بہن بیٹی کا رشتہ حرمت ختم، علیٰ ہذا القیاس۔ ①

چنانچہ آٹھ سال سات ماہ قید کے بعد آخر سزا پر عملدر آمد اس طرح کیا گیا کہ پہلے اُسے ایک ہزار کوڑے لگائے گئے۔ روزانہ اُسے سولی پر لٹکایا جاتا اور سنگ زنی کی جاتی۔ شورش سے بچنے کے لیے باقی سزا جلدی اس طرح دی گئی۔ پہلے دن اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ اُس دن اُس کے دوست ابو بکر شبلی نے دریافت کیا۔ بتاؤ تصوف کسے کہتے ہیں؟ جواب دیا کہ جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ اُس کا ادنیٰ درجہ ہے۔ پوچھا کہ اعلیٰ درجہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ کل دیکھ لینا۔ دوسرے دن اُس کے کان، ناک، زبان کاٹے گئے اور آنکھیں نکالی گئیں۔ پہلی دن ہاتھ کٹنے کے بعد حلاج نے خون آلودہ بازو چہرے پر مل لیے تاکہ خون نکل جانے کی وجہ سے چہرے پر زردی سے وہ کمزور، خوفزدہ اور غمگین نظر نہ آئے۔ گویا وہ چیلنج قبول کر رہا تھا۔ بقول فیض: ②

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا
(فیض احمد فیض)

---

① ایضاً، ص ۱۸۸-۱۹۱-۱۹۵۔

② ایضاً، ص ۲۱۲۔

تیسرے دن حلاج کی گردن اتار دی گئی۔ اُس کے جسم کو جلا دیا اور راکھ دریائے دجلہ میں بہادی گئی۔ اس تمام اذیت ناک اور انتہائی وحشیانہ سزا کو حلاج نے نہایت صبر، حوصلے، اطمینان اور استقامت سے برداشت کیا۔ گویا اُسے سزا کی بجائے جزا مل رہی ہے۔ اُسے اپنی منزل مل گئی اور وہ اپنے انجام پر شاد و شاکر و مطمئن ہے۔ فیض نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔[①]

راہ تھی فیض سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

اسی رمز میں فیض نے یوں بھی کہا ہے:

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

حرفِ آخر کی طور پر حضرت داتا صاحب کا فرمان فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے کہ حلاج سرمستانِ بادۂ وحدت اور مشتاقِ جمالِ احدیت تھا۔ ایسے صوفیا چونکہ مغلوب الحال، استقامت اور سلامت روی سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کا کلام لائقِ اتباع و پیروی نہیں ہوتا۔

تاہم علامہ اقبال کے نزدیک حلاج کی عشقِ الٰہی میں غرق اور سرکارِ دو جہاں کی محبت میں سرفروشانہ اور مجاہدانہ زندگی میں بھی دوسروں کے لیے عملِ پیہم اور خودی کی نشو و نما کا پیغام ہے کہ وہ دنیا میں آئے ہیں تو کچھ کر کے اور بن کر دکھائیں۔ جو انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ چاہے اس کٹھن راہ میں کتنے ہی مصائب کیوں نہ جھیلنے پڑیں۔ چنانچہ حلاج کے بارے میں مذکورہ بالا معروضات کا خاتمہ اس شعر پر مناسب معلوم ہوتا ہے:

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

① ایضاً، ص ۲۱۵۔

اقبال کا نظریہ توحید و رسالت - ایمان و یقین اور زندگی

فرمودۂ اقبال ہے:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

عالم اسلام کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو نظر آتا ہے کہ ہادیٔ برحق حضرت رسول ﷺ کی بعثت کے بعد ہدایت و رشد کے ذریعے جو علمی و عملی انقلاب آیا اس کے نتیجہ میں ایمانی جوش و جذبہ کے تحت ایک سو سال کے عرصہ میں ملتِ اسلامیہ کرۂ زمین پر تین بڑا عظموں کے وسیع و عریض علاقہ پر فاتح قوم کی حیثیت سے حکمرانی کرنے لگی اور چھ سو سال تک سقوط بغداد سے پہلے ان کے زیر نگیں ممالک میں دین اسلام کی حقانیت کے زیر اثر تمام علوم متداولہ میں بے پناہ ترقی ہوئی۔ دینی علوم کے علاوہ عمرانیات، طب، ادب و سائنس، تعمیرات، ہندسہ اقلیدس اور دیگر علوم وفنون کو بہت فروغ ملا اور یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ مغربی سائنسی ترقی عالم اسلام کی بنا کردہ تہذیب و ترقی کی توسیع ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ گیارہویں صدی کے آغاز میں سلطان محمود غزنوی کے ایک بے مثل متبحر عالم ابوریحان البیرونی نے زمین کا محیط ۲۵ ہزار میل کے قریب حساب لگا کر بتا دیا تھا۔ جب کہ اس وقت یورپ جاہلیت اور پست معاشرتی حالت میں تھا۔ تقریباً ۵۰۰ سال بعد سولہویں صدی میں دنیا کے مسیحی مرکز اٹلی میں گلیلیو نے زمین کے گول ہونے کا اعلان کیا تو عیسائی مذہبی پیشواؤں اور عوام نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا کر موت کی سزا دے دی۔ بے چارے گلیلیو ۔ ۔ ۔ ان بچانے کی خاطر اپنا اعلان واپس لے لیا اور نہایت عاجزی سے اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہو۔ ے معافی کا خواستگار ہوا۔ اس پر بھی اُسے یہ رعایت دی گئی کہ اُسے کفر کے جرم کی پاداش میں ملک بدر کر دیا گیا۔

عیسائی دنیا نہ جانے کب تک پس ماندہ حالت میں رہتی۔ اگر اسپین کی مسلمان حکمرانوں

کی قائم کردہ درسگاہوں سے غیر مسلم یوروپین لوگوں کو حصول تعلیم کا موقع نہ ملتا۔ جس کے بعد استفادہ کرنے والوں میں مارٹن لوتھر، والٹیر، روسو، لاک، ہوبز جیسے سکالرز نے کلیسائی علما کی جاہلیت کا پول کھولا اور اُن کی جاہلانہ جمود پر مبنی رسوم و رواج و عقاید کے خلاف بغاوت کر کے اسلام کی روشن خیالی کو رہنما بنا کر علوم جدید، سائنس و حکمت، صنعت گری کی طرف رجوع کر کے ایسے انقلاب کا آغاز کیا۔ جس کے نتیجہ میں آج کی مغربی ممالک کی حیران کُن ترقی ہمارے سامنے ہے۔

اس کے برعکس مسلمان رفتہ رفتہ سہل پسند ہو کر ایمان و یقین و تعمیری عمل سے دور چلے گئے اور ان کی عظمت اور شان و شوکت بقول علامہ اقبال استبدادی ملوکیت، خود غرض ملائیت اور تارک عمل خانقاہیت کے تباہ کن اثرات سے انھی مغربی قوتوں کے محکوم ہو گئے۔ جن پر کبھی وہ خود حکومت کرتے تھے۔ اس کیفیت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اس اندوہناک حالت کو غنی کشمیری کا شعر اقبال نے حوالے کے طور پر اپنے کلام میں لکھا ہے:

غنیؔ، روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخارا

مگر حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو خود کردہ را علاج نیست۔ اس ادبار، پستی و بدنصیبی اور پس ماندگی کی ذمہ دار خود انتشار شدہ عیش و سہل پسندی کی عادی ملتِ اسلامیہ ہے۔ اقبال نے یہ ساری داستان ایک شعر میں سمو دی ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

یوں تو عالم اسلام گذشتہ کئی صدیوں سے سقوط بغداد، سقوط غرناطہ اور ۱۹۲۱ء میں اختتام خلافت عثمانیہ مغربی استعماری قوتوں کے ذریعے ایک عبرتناک سلسلہ ہے۔ مگر ہندوستان جہاں

کی ہماری اپنی بود و باش ہے اُس کی داستان بھی ایسی ہی المناک ہے کہ سینکڑوں برسوں ہندوستان پر متواتر حکومت کرنے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد نفس پرست، عیاش، کوتاہ اندیش مغل حکمرانوں کا سلسلہ چل پڑا۔ انگریزوں نے جو تاجروں کی صورت میں ہندوستان میں وارد ہوئے انھوں نے حکمرانوں کی کمزوری کو بھانپ لیا اور ان کی باہمی عداوتوں و نا اتفاقی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید ایک دوسرے کو آپس میں بدظن کر کے لڑاتے اور بک جانے والے غداروں کے ذریعے آہستہ آہستہ ہندوستانی حکومتوں کو ختم کرتے ہوئے ملک پر اپنی حاکمیت قائم کر لی۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی، غدار میر جعفر کے ذریعے بنگال پر قبضہ ۱۷۹۹ء میں میسور کے شیر دل حب الوطن ٹیپو سلطان کو نواب صادق کی غداری کے ذریعہ اور ۱۸۵۷ء میں نام کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے تیموری خاندان کو مٹاتے ہوئے آخرِ شب چراغ سحری کی طرح [illegible] کی حکومت کو بھی گل کر کے بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ جس کے بعد [illegible] ہند کا نہایت پر آشوب دور شروع ہوا۔ پہلے تو انگریزی فوج نے بغاوت کے الزام میں اَن گنت مسلمانوں کو مسلمان ہونے پر تہ تیغ کیا، پھانسیوں پر لٹکایا، کالے پانی کی عمر قید سزائیں دیں۔ معاشرتی طور پر شکست خوردہ مسلمانوں کی ذلت اور نکبت انتہا کو پہنچ گئی۔ جب فارسی کی جگہ ملک و دفاتر میں انگریزی زبان رائج کر دی۔ تمام مسلمان یکسر بے روزگار ہو گئے۔ متعدد علماء نے انگریزی زبان میں حصول علم کو خلاف اسلامی عمل قرار دیا۔ مگر ہندوؤں نے فوراً انگریزی زبان میں تعلیم قبول کر لی۔ انگریزوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں صلیبی جنگوں کی وجہ سے ویسے ہی عداوت و نفرت تھی۔ انھوں نے ہندوؤں پر اہم ملازمتوں کے دروازے اور با اختیار ادارے وا کر دیے۔ اور تمام تجارت پر ویسے ہی ہندو قابض تھے۔ ان حالات میں مسلم قوم کی معاشی حالت سخت بدتر ہوتی گئی۔ مزید براں مسلم شرفا کی کمزوری مالی حالت میں انھیں قرضے دے کر ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر جائیدادیں اور زمینیں قرق کرانی شروع کر دیں۔ ہندو کارندے جو پہلے مسلمانوں کے ملازم، منشی، زمینوں پر کاشت کرنے والے مزارعے تھے۔ مالک بن گئے۔ غالب کی مثال دی جا سکتی ہے جس کا والد چچا، سسر و دیگر رشتہ دار نواب جاگیردار تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے سانحے کے بعد نہ جاگیریں رہیں، نہ پنشن، نہ مغل بادشاہ کا وظیفہ رہا۔ تنگدستی کی حالت میں گھر کے برتن اور کپڑے بیچ کر کسی طرح اپنی اور افراد خانہ کی تن

پروری کرتا رہا۔ تمام عمر کرائے کے مکانوں، قرض خواہوں کے تقاضوں، نالشوں اور مفلسی کے ہاتھوں عذاب میں گزری۔ تاوقتیکہ نواب رامپور نے غالب کی دستگیری کا ذمہ لیا۔ غالب جیسے نابغۂ عصر شخصیت کی زبوں حالی و بے قدری سے عام مسلمانوں کی حالت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

مگر مسلمان جو علمی، عقلی، استعداد، دیگر فنون میں دوسری قوموں سے کہیں برتر تھے۔ حالات کی مشکلات کے باوجود ناامید نہ ہوئے۔ اُن میں سرسید اور ان کے مخلص رفقاء نے وقت کی نبض کو سمجھ کر حالات سے نپٹنے کا لائحہ عمل وضع کر لیا اور انھوں نے بدیشی حاکموں اور مقامی مخالف قوم سے نبرد آزما ہونے کے لیے قوم کے دل سے مایوسی اور ناامیدی ختم کرنے کے لیے گذشتہ اسلامی عظمت کا احساس دلایا اور کھوئی ہوئی شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے حالات کے تقاضوں کے مطابق باوقار طریقہ سے جدید علوم سے خود کو آراستہ کرنے کی تلقین کی۔ منزل کی درست سمت طے ہو گئی تو اسلامیان ہند حصول آزادی کے لیے کوشاں ہو گئے۔

علامہ اقبال ان مخلص رہنماؤں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ جو اپنے بے پایاں علم، مسلمانوں کے علاوہ تمام انسانیت کے دردمند، عمل و حرکت کے علمبردار، توحید اور رسالت پر مکمل ایمان و پیہم عمل پر یقین رکھنے والے۔ خود آگاہی، و خود شناسی سے اپنے اوصاف کو بروئے کار لا کر قوم کو رفعتوں پر دیکھنے کے بے حد متمنی تھے۔ اور صحیح معنوں میں حکیم الامت تھے۔ انھوں نے قوم کو بیدار کرتے ہوئے خالقِ کائنات اور اس کے محبوب کی لاریب تعلیمات پر مکمل ایمان و یقین کے ذریعہ مسلسل جدوجہد، تگ و تاز، جسے وہ عشق کا نام دیتے ہیں، کے ذریعے خودی کی تکمیل کا درس دیا۔ جنھیں جذبہ عشق اور ذوق و شوق کے ذریعے حصول منزل میں کامیابی، قرب الٰہی میں کامرانی کے ساتھ ماورائی مراتب بھی عطا ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور ان کے افعال و اعمال میں خدا تعالیٰ کی رضا شامل ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

خاکی و نوری بندۂ مولا و صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل پاک باز

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

غرضیکہ دین اسلام کا سچا پیروکار ہونا جو کامیابی کی ضمانت ہے آسان نہیں۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

چنانچہ اقبال کے پیمبرانہ کلام کو اسلامیان ہند نے حرز جاں بنا کر آزادی وطن کے حصول اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب رسول مقبولؐ پر کامل ایمان رکھتے ہوئے۔قائداعظم کی بے مثل قیادت میں متحد ہو کر ہر قربانی کے جذبہ سے سرشار اپنے لیے آزاد وطن کے حصول کی منزل تک پہنچ گئے اور اقبال کی بشارت کو سچا ثابت کر دیا کہ:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ، ذہنِ ہندی ، نطقِ اعرابی

گویا اقبال اسلامیان ہند کے لیے منارۂ نور ثابت ہوئے جس کی ایمان، یقین اور صدق کی فطری رفعتوں نے ان کے دلوں کی مایوسی ، نا امیدی اور تاریکی کو حرارت ایمانی، ولولہ تازہ اور پر جوش عزم و ہمت میں بدل کر نا قابل تصور امکان کامیابی کی راہ دکھائی۔

مناسب لگتا ہے کہ عنوانات کے بارے میں مختصر ذکر کے ساتھ اقبال کے چیدہ چیدہ اشعار صراحت کے لیے پیش کیے جائیں۔

توحید، ایمان و یقین

اقبال ایک عظیم شاعر، مصلح و مفکر ہے۔ اس کی تمام شاعری کا منبع قرآن حکیم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جس سے اس نے توحید، رسالت پر مکمل ایمان، بندگی، اطاعت اور ضبطِ نفس کی موثر تلقین کی تاکہ قوم وسیع کائنات کو پیدا کرنے والے اور اس کے پرفیکٹ نظام کو مصروفِ اطاعت دیکھ کر خود بھی اپنے اعمال میں اطاعت شعار بن کر قربِ الٰہی سے سرفراز ہو اور بے یقینی و گمان سے پاک ہو کر بحیثیت نائبِ حق تعالیٰ اُس کی صفات کا حامل ہو جائے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل، کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ وہ کارواں تو ہے

توحید کی عظمت کا معترف ہونے کے لیے یقین لازمی ہے کہ نظامِ ہستی کو چلانے والی قوتِ لازوال، بے مثال و بے مثل ہے اس کے نظام کا مسلسل منضبط انداز میں رواں دواں رہنا، گردشِ لیل و نہار اور حیات و ممات کا سلسلہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ عظیم ہستی جو سارے نظام کی خالق ہے۔ اس پر دل سے ایمان لایا جائے۔ توحید الٰہی پر یقین کے ساتھ عشق الٰہی کے وجدان سے فہم و ادراک کے دَر وا ہوتے ہیں۔ یہ سرمدی کیفیت عرفانِ ذات کی نعمت سے سرفراز کرتی ہے۔ ذاتِ باری پر ایمان و یقین ہی اقبال کے تصورِ خودی کی اساس ہے۔ فرمایا کہ:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسماں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی کے عرفانِ ذات سے ہی انسان خالق کائنات کی عظمت و کبرائی کا ادراک کر سکتا ہے:

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

عشقِ الٰہی میں بے پناہ قوت کا راز مضمر ہے۔

ایں دو حرف لا الہ گفتار نیست
لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است
لا الہ ضرب است و ضربِ کاری است
قوتِ ایماں! حیات افزایدت
وردِ ولا خوف علیہم بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلبِ او از لا تخف! محکم شود
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے
مردِ حق محکم ز وردِ لا تخف
ما بمیداں سر بجیب، او سر بکف
مردِ میداں زندہ از اللہ ہوست

زیرِ پائے اُو جہانِ چار سو است

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

جب تک ترے ضمیر پہ نازل نہ ہو کتاب
گرہ کشاہ ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تُو سمجھا نہ میں سمجھا

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا ہے؟ غارت گرِ باطل بھی تو

یقین مثلِ خلیل آتش نشینی
یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے بد تر بے یقینی

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اقبال کی نظم، نثر واضح طور پر زندگی کے بنیادی امور و مسائل کو آشکار کرتی ہے جو قرآن حکیم کی توضیح و تشریح سے ہمارے لیے لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا راستہ واضح اور آسان ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ ہم کلامِ اقبال کو توجہ دیں اور سمجھ کر خلوص دل سے اس پر عمل کریں۔ کیونکہ اقبال اپنی شاعری کی مدح و ستائش کا بالکل خواہاں نہیں۔ وہ تو صرف بھٹکی ہوئی قوم کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے شاعری کا سہارا لیتا ہے۔ جو یوں ظاہر ہے۔

شعر کجا و من کجا شعر و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبال نے مغربی سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کو مسترد کر دیا ہے اور یقین و اعتماد کے ساتھ اسلامی تعلیمات، اطاعت خدا اور رسول ﷺ مخلوق کے لیے دردمندی، اخلاص، جدوجہد، عمل پیہم کی طرف اپنی قوم کو راغب کرنے کی سعی ہے۔ جو ہمارے مصائب و مشکلات کا تریاق ہے ہمیں اس کے پیغمبرانہ کلام سے اذہان و قلوب کو منور کرنا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک ایمان، یقین و اعتماد کے بغیر سیرت و کردار ناممکن ہے۔ تنازع للبقا کی زبردست آویزش میں وہی کامیاب ہوں گے جنھوں نے پُراعتماد طریقے سے زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کیا۔ روشن مستقبل کی امید رکھ کر پورے اخلاص، ذوق و شوق سے محنت و جدوجہد کرتے رہے۔ اور آخر کامیاب ہو کر جریدۂ عالم میں اپنا نام روشن کارناموں سے ثبت کر گئے۔

عشق اطاعت رسول ﷺ:

اقبال کے نزدیک اتنا ہی ضروری ہے جتنا عشقِ اطاعتِ الٰہی ہے۔ جن کی ذاتِ اقدس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ہدایت کا ذریعہ و وسیلہ بنایا۔ جن کے لیے یہ کائنات بنائی گئی جو رحمۃ للعٰلمین کے لقب سے سرفراز کیے گئے جن کے لیے وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کہا گیا۔ جن کی امامت کے طفیل زمین آسمان، جسمانی، روحانی ظاہری و باطنی منازل تک رسائی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کی مدح میں اقبال کی نعت کے ان اشعار پر غور کیجیے:

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

(یہ ذرہ ریگ اقبال نے خود کو کہا ہے کہ حضور کے طفیل اُسے کیا قدر و منزلت نصیب ہوئی)۔ اقبال مزید گویا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰا
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردُوں
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے!
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے!

زندگی

اقبال کا کلام چونکہ انسانی زندگی کے ارتقا، سربلندی اور بقا کے لیے ہے۔ اس لیے دیکھتے ہیں کہ اقبال زندگی کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے۔ اقبال کو خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر مکمل ایمان ہے جس نے وسیع کائنات کی تعمیر کی۔ جس کا کسی انسانی پیمانے سے احاطہ نہیں کیا جا سکتا پھر بھی وہ اس کو مزید وسیع کیے جا رہا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

مگر خدا نے جو کائنات بنائی ہے اس کے استعمال کے لیے انسان کو تخلیقی، تدبیری، تحقیقی، تعمیری، تفسیری، انتظامی جوہر ودیعت کر کے اپنے نائب کی حیثیت سے دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ

اس کی تسخیر کرے اور اس کی فطری صورت و شکل میں مزید حسن اور نکھار پیدا کرے۔ اور ضرورت کے مطابق نئی چیزیں ایجاد اور تعمیر کرے۔ کیونکہ اب انسان کو محروم شدہ جنت کو بھلا کر دنیا کو ہی جنت کی بہتر صورت دینی ہے۔ بقول اقبال:

توڑ ڈالیں فطرتِ انسانی نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک؟

اور انسان اپنے اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے بیتاب ہے اور یوں اظہار خواہش کرتا ہے:

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

اور اقبال بھی اس کی ہمنوائی میں بتاتا ہے:

وہی جہاں ہے ترا جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

آدم اپنی نیابت کو اس طرح خدا تعالیٰ کے سامنے درست ثابت کرتا ہے۔

تُو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی بھٹکی ہوئی خوابیدہ قوم کو بیدار کر کے ماضی کے شان و شوکت کے کارنامے سرانجام دینے پر پھر آمادہ کرے اس کے نزدیک زندگی بہت بڑی نعمت ہے۔ جو اُسے دیے ہوئے اوصاف کو بروئے کار لا کر تخلیق فکر و عمل کے امتحان کے لیے ہے۔

دیکھیے اقبال انسان کو متحرک اور باعمل بنانے کے لیے گوش گذار کرتا ہے!

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

آئی صدائے جبریل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی
تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں
ضمیر لالہ میں روشن چراغ جستجو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اقبال انسان کے دل سے موت کا خوف مٹا دیتا ہے کہ موت کی کوئی حقیقت نہیں اصل شے زندگی ہے جو ابدی و لازوال ہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
موت کو کہتے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

جوہرِ انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

چنانچہ اقبال کا یہ حیات بخش کلام تمام انسانوں بالخصوص مسلم قوم کے لیے بہت بڑی عطا اور احسان ہے کہ اس نے انسان کے دل سے موت کا خوف دور کر کے اُس کے دل میں حیاتِ جاوداں کی امید پیدا کی ہے۔

مضمون کے حرف آخر کے طور پر عرض ہے کہ آج کل وطنِ عزیز انتہائی پریشان کن مسائل سے دوچار ہے۔ جس کا حل صرف قرآن حکیم کی ہدایات جس کی اقبال نے اپنی قومی زبان میں بہترین تشریح کی ہے پر پورے طور پر عمل پر ہے جو ہمارے لیے از حد خوش قسمتی اور روشن مستقبل کی ضمانت ہے لیکن موجودہ ارباب اختیار جان بوجھ کر اقبال سے بے اعتنائی برت رہے ہیں کہ یہ ان کی ناجائز نفسانی خواہشات پر قدغن لگاتا ہے۔ خدا کرے ہمیں ایسے قائد و رہنما نصیب ہوں جو دین سے مخلص ہوں اور کلام اقبال نظم و نثر کی معجزنما اہمیت پر یقین رکھتے ہوں۔

[نوٹ: مضمون میں تمام اشعار کلیاتِ اقبال سے ماخوذ ہیں]

علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کا آئینۂ استقبال- پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کا خورشید آزادی کی خوشخبری کے ساتھ طلوع ہوا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ کیا ساعتِ سعید تھی کہ رمضان المبارک کا مہینہ، ستائیسویں یعنی لیلۃ القدر اور جمعۃ الوداع کا مبارک دن تھا۔ جن سے پاکستان کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت، عنایت کی تصدیق ہوتی ہے۔ نئے آزاد ملک کی فضا پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد، علامہ اقبال زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ مسلمانانِ پاکستان سجدۂ شکر بجالائے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں عالمی سطح پر سب سے بڑے اسلامی مملکت اور دنیا کے ممالک میں پانچویں بڑی ریاست عطا کی تھی۔ یہ ایک معجزہ لگتا ہے کہ صرف سترہ سال پہلے ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی طرف سے صدارتی خطبۂ الہ آباد میں مسلمانوں کو اکثریت والے حصے کو مسلمانوں کا الگ آزاد وطن قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اس کے حصول کی کوشش کے تقریباً سات سال بعد ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مگر آزادی کا وہ جذبہ جو وہ قوم کے دل میں سمو گئے تھے اسے حرزِ جاں بنا لیا گیا۔ اُن کی وفات کے دو سال بعد ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور بمقام اقبال پارک قرارداد لاہور جو قرارداد پاکستان کہلائی۔ زیرِ صدارت قائد اعظم مسلمانانِ ہند کی طرف سے مطالبہ کیا کہ پاکستان کے ساتھ منظور ہوئی جس میں جس میں قائد اعظم نے فرمایا کہ یہ قرارداد مسلم قوم کو الگ آزاد وطن کے لیے اٹل فیصلہ ہے جس سے ہم کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ انھوں نے فرمایا کہ آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے کہ ان کے بعد ہم وہی کر رہے ہیں جو وہ چاہتے تھے اور تقریباً ساڑھے سات سال بعد اقبال کے آزاد وطن کا خواب ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو تمام عالم نے پورا ہوتے دیکھا۔ جس کی بشارت اقبال کے کلام میں کئی جگہ ملتی ہے۔ جیسے کہ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی (۱)

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے (۲)

اور یہ حقیقت ہے کہ آزاد وطن کا پورا ہونے والا خواب اقبال جیسے دیدہ ور، دانائے راز، صاحب حال وجدان و عرفان کو ہی آ سکتا تھا۔ جو بے پایاں علم و حکمت کے ساتھ فقر و استغنا، درویشی و بے نیازی صفائے قلب اور حق گوئی کی ملکوتی صفات رکھتا ہو اور نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز کا مرقع ہو۔ انھوں نے اپنی الہامی شاعری کا اظہار یوں کیا ہے:

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش (۳)

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز درونِ مے خانہ (۴)

وہ اپنی باکمال شاعری کو صرف خوابیدہ پس ماندہ، منتشر قوم کو بیدار کرنے اور ایک صحیح سمت میں متحد عمل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ فرمایا:

شعر کجا و من کجا شعر و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را (۵)

وہ سمجھتے تھے کہ انھیں خدا نے قوم کی رہنمائی کا فریضہ سونپا ہے۔ جس اظہار یوں کیا ہے:

---

(۱) کلیاتِ اقبال اردو، ص ۱۹۳۔
(۲) ایضاً ص ۱۹۵۔
(۳) ایضاً ص ۱۸۹۔
(۴) ایضاً ص ۳۴۳۔
(۵) ایضاً فارسی، ص ۳۴۴۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
تیرے لیے ہے میرا شعلۂ نوا قندیل ①

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی ②

اقبال اُمید اور یقین کا شاعر ہے۔ اُسے یقین تھا کہ مسلمانوں کی منزل آزاد وطن پاکستان ہے جو حاصل ہو کر رہے گی۔ چاہے یہ اُس کی زندگی میں دیکھنے کی قسمت میں نہ ہو۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا:

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرک بہار کر ③

یعنی مسلمانوں کی آزادی کا دن اگرچہ آ کر رہے گا۔ لیکن اگر میری زندگی میں یہ آرزو پوری نہ ہو تو میرے کلام میں آزاد وطن کے لیے جو پرسوز پکار ہے۔ اسے آزادی کی آمد کا نغمہ بنا دے۔

مگر یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم کشیدگی اور جھگڑے فساد کی فضا کے پیش نظر تقسیم ہند کے بعد مسلم اکثریت والے علاقوں میں آزاد مسلم وطن کا مطالبہ بغیر تبادلۂ آبادی کے جو فریقین کے لیے آئندہ امن اور ترقی کے فروغ کا باعث ہوتا۔ کیونکہ دنیائے اسلام کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے مسلم آبادی کی نسبت غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق، جان و مال کے تحفظ کا زیادہ اہتمام کیا ہے مگر کانگرسی متعصب قیادت کے ناپاک اور اسلام دشمن عمل کی وجہ سے مسلم قوم کو آزادی کے مقام تک پہنچنے کے لیے خاک، خون اور آگ کے دریاؤں سے گذرنا پڑا۔ جس سے بڑے تباہی و بربادی ہوئی مشرقی پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ اُن کی آبادیاں، کھیت کھلیاں تباہ کر دیے گئے۔ پچاس لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان ہجرت کرنی پڑی۔ جن میں نہتے پاپیادہ قافلوں پر ہندو سکھوں نے

---

① ایضاً، دو، ص ۳۵۵۔
② ایضاً، ص ۳۶۸۔
③ ایضاً، ص ۲۹۹۔

حملے کر کے کئی لاکھ مسلمان شہید کر دیے۔ کئی ریل گاڑیوں میں آنے والوں کو کاٹ ڈالا گیا۔ ہزاروں عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ غرضیکہ ایسی درندگی وبہیمت کا مظاہرہ کیا گیا کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی تباہیاں بھی ہیچ لگتی ہیں۔

راقم کا تعلق شہر اقبال سے ہے اسے فخر ہے کہ اس نے مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ جہاں اقبال بھی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور ان کے عظیم المرتبت استاد مولوی میر حسن اسی درسگاہ میں بطور معلم شروع سے آخری عمر تک تمام طالبعلموں کو بلا تمیز مذہب وملت نہایت محبت شفقت سے علم سے فیض یاب کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی سب اُن کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ اقبال اور اُن کے استاد جیسے اہل علم وحکمت اور انسان دوستی کا جذبہ رکھنے والی شخصیتوں کے طرز عمل نے کالج اور شہر کی فضا میں امن سلامتی اور خیر سگالی کے رویوں کو ہمیشہ قائم رکھا۔ اور باہمی محبت، رفاقت میں زندگی گذرتی رہی مگر سیاسی زندگی کی تحریک میں جب ہندو کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلافات بڑھنے لگے تو اس کا اثر کالج کی فضا اور مقامی سطح پر بھی پڑا۔ خاص کر ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے دوران تناؤ خاصا بڑھ گیا۔ ہندو سکھ معاشی و اقتصادی طور پر مسلمانوں سے کہیں آگے تھے سیاسی طور پر بھی وہ بہت متحرک تھے۔ مگر اقبال کے معجزانہ کلام کے زیر اثر مسلمان بھی کافی بیدار ہو چکے تھے۔ اقبال بچپن سے ہی شعور کی بلندیوں پر تھے۔ جس میں عالمگیر انسان دوستی اور باہم پیار ومحبت کے جذبات فطری طور پر فرواں تھے۔ انھوں نے ابتدائی زندگی میں دو عشق کیے۔ ایک عشق تو حصول علم کے لیے تھا۔ جس میں ان کی رفتار حیرت ناک تھی اور دوسرا عشق ہندوستان کی سرزمین سے کیا۔ جس میں وہ پیدا ہوئے اور مطالعہ ومشاہدہ سے ہندوستان کی قدیم اور نئی بڑی شخصیتوں مثلاً راجہ رام چندر، سری کرشن، مہاتما بدھ، راجہ بھرتری ہری، رشی وشوامتر، گرونانک وغیرہ۔ جن کی علمی معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات اور ملکِ ہند کے فطری حسن کے بڑے مداح تھے جن کی تعریف میں اقبال نے ایسی دلفریب نظمیں لکھیں جن کی مثال کوئی بڑے سے بڑا صاحب علم غیر مسلم پیدا نہیں کرسکا۔

مثلاً بانگِ درا کی پہلی نظم "ہمالہ":

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں ①

پھر ترانہ ہندی لکھا جس کا ہر مصرعہ دل کو چھو لیتا ہے۔ ایسا ترانہ کسی ہندو شاعر سے تخلیق نہیں ہو سکا۔ اور اب بھی ہند میں رائج ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا ②

پھر ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھا جو مشترکہ سب قوموں کے بچوں کا ہے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا ③
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

اس کے علاوہ ہندو برہمنوں اور مسلم واعظین کو باہمی اختلافات بڑھانے سے روکنے کے لیے پیار محبت کی تعلیم دی:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
ترے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے ④

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں ⑤

---

① ایضاً، ص ۲۱۔
② ایضاً، ص ۸۳۔
③ ایضاً، ص ۸۷۔
④ ایضاً، ص ۸۸۔
⑤ ایضاً، ص ۳۲۔

ہندو مسلم اختلافات بڑھنے پر دکھی دل سے ملک میں بسنے والوں کو برے نتائج سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں:

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے ①

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں ②

آپ ہی کہیے۔ ایسا محبت، خلوص سے لبریز بلا تعصب کلام کسی بڑے سے بڑے ہندو شاعر کو لکھنا نصیب ہوا؟ ہندوؤں کو تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں باہمی اختلافات دور کرنے والا اقبال جیسا عظیم مصلح انسان پیدا ہوا ہے۔ مگر ہندو قوم کے متعلق ایک ہزار سال پہلے محمود غزنوی کا درباری عالم ابوریحان البیرونی جو اپنے زمانے کے علوم میں طاق تھا۔ اپنی مشہور تصنیف کتاب الہند میں جو اُس نے ہندوؤں کے ساتھ کافی مدت گزارنے کے بعد لکھی، تحریر کیا کہ ہندو عجیب وغریب شکی مزاج متعصب قوم ہے۔ کسی دوسرے کو قریب نہیں آنے دیتی۔ نہ ہی کسی پر اعتماد کرتی ہے۔ نہ خود اعتماد کے لائق ہے۔ ذات پات اور چھوت چھات کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ انسانوں کو درجوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اور نچلی ذات کے لوگوں سے نفرت کرتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ملیچھ و ناپاک سمجھتی ہے۔ کسی دوسرے سے مل کر رہنا پسند نہیں کرتی۔ ③

اقبال نے ہندوستان کی عظمت کے اتنے بلند پایہ نغمے سنانے کے باوجود دیکھا کہ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن وائسرے ہند نے انتظامی ضرورت کے تحت بنگال کو تقسیم کر کے مشرقی بنگال جس میں مسلمان کاشتکاروں، محنت کشوں مزدوروں کی آبادی زیادہ تھی الگ صوبہ بنا دیا۔ جنھیں مغربی حصے کے ہندو سرمایہ داروں، ساہوکاروں اور صنعتکاروں نے استحصال کا نشانہ بنایا

① ایضاً، ص ۱۷۔
② ایضاً، ص ۱۵۹۔
③ مسلم لیگ از ایس ایم بشیر ناشر پاک پرنٹرز اینڈ پبلشرز لاہور، ص ۳۰۔

ہوا تھا۔ تا کہ وہ نئے قوانین وضع کر کے ہندو سرمایہ داروں کے استحصال سے بچ کر بہتر معاشی اور معاشرتی زندگی گزار سکیں۔ مگر ہندو قوم مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری کو برداشت نہ کر سکی اور تقسیم بنگال کے خلاف ملک گیر ایسی پرتشدد اور جنونی تحریک شروع کی کہ انگریز حکومت کو بنگال کی تقسیم کو مجبوراً منسوخ کرنا پڑا۔ یہ دیکھ کر اقبال پر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ہندو کسی صورت میں مسلمانوں کی بھلائی نہیں چاہتے۔ لہٰذا ہندوستان میں مسلمانوں کو ہندو استحصال اور غلامی سے بچانے کے لیے تحریک آزادی کو نیا رخ دے کر مسلمانوں کی آبادی کی نسبت سے اسمبلی میں سیٹوں کی تعداد کا تعین اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کر دیا۔ جس پر وہ آخر دم تک قائم رہے۔ جس کے تحت انھوں نے صدارتی خطبہ الٰہ آباد مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم اکثریت والے علاقوں میں آزاد مسلم وطن کا مطالبہ کر دیا۔ اور اسی احساس کے نتیجہ میں ترانہ ملی لکھا:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

قائداعظم نے بھی ہندو قیادت کی ہٹ دھرمی کو ناقابل اصلاح سمجھ کر اپنی بے نظیر قیادت میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کو ممکن بنا کر دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ مگر اس مرحلہ تک پہنچنے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ پر باہم سمجھوتہ کے بعد مذاکرات کے کئی کٹھن مقامات آئے جن میں ہر دفعہ کانگریسی قیادت نے مسلم لیگ کی طرف سے انتہائی نرم شرائط جس سے مسلمانوں کے صرف بنیادی حقوق کا تحفظ مقصود ہوتا تھا تا کہ دونوں قومیں امن و آشتی سے مل جل کر رہ سکیں۔ پایۂ حقارت اور تکبر سے ٹھکرا دیتی۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو آئندہ وقت میں اپنے غلام اور محکوم کے طور پر دیکھتی تھی۔ ۱۹۳۵ء کے الیکشن میں کانگریس پورے عروج پر تھی اور مسلم لیگ ابھی جاگیرداروں، زمینداروں متمول اور خطاب یافتہ لوگوں تک محدود تھی اور عوامی جماعت بننے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس الیکشن میں کانگریس کو بہت زیادہ کامیابی ہوئی اور مسلم لیگ ناکام رہی۔ حتیٰ کہ پنجاب میں ۸۶[1] میں سے صرف دو سیٹیں

[1] ایضاً ص ۲۳۔

حاصل کر سکی۔ چنانچہ کانگرس کا تکبر اور رعونت ساتویں آسمان تک پہنچ گیا اور جواہر لال نہرو نے بڑے غرور سے کہا کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں۔ ایک حکومت برطانیہ اور دوسری نیشنل کانگریس۔ اس پر قائداعظم نے اُسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ یہاں تیسری طاقت مسلمان قوم (۱) بھی ہے۔ جن کے حقوق کے تحفظ کے بغیر ملک کی قسمت کا کوئی فیصلہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قائداعظم جان چکے تھے کہ انگریز بغیر کوئی منصفانہ فیصلہ کیے چلا گیا تو ہندو کانگرس مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنا کر ماضی کی محکومیت کا بدلہ اتارتی رہے گی۔ اور علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ہی تقسیم بنگال پر ہندوؤں کا اسلام دشمن رویہ دیکھ کر مسلم آبادی کے لیے جداگانہ انتخاب کا اٹل اعلان کر دیا تھا۔ اقبال ہندوؤں کی بدعہدی اور کہہ مکرنیوں کے باعث کانگریس قیادت کو ہرگز قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے اُنھوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ ہندو کانگریس کی اپنی لکھی ہوئی شرائط پر مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرے گی تو بھی وہ خود ہی کچھ عرصہ بعد اس میں کوئی نہ کوئی انحراف کا پہلو نکال لے گی۔ (۲) اقبال نے ۱۹۲۶ء میں جب وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے

---

(۱) ایضاً، ص ۶۱ - ۷۳۔

(۲) جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۵۱۳۔

اقبال کی یہ رائے تاریخی حقائق اور ان کی وجدانی بصیرت پر مبنی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ پر کانگرس اور لیگ میں جداگانہ انتخاب پر سمجھوتہ ہو گیا جو قائداعظم کی فراست، تدبر اور ہندو مسلم ارباب سیاست میں ان کی ہر دلعزیزی کی طفیل تھا۔ مگر اس کے بعد قیام پاکستان تک جتنے بھی باہم مذاکرات، اجلاس، کانفرنسیں و نامہ و پیام ہوئے ان میں کانگرسی قیادت اور ہندو پریس کا کردار نہایت معاندانہ، منافقانہ، تکبر اور حقارت آمیز رہا۔ مثلاً ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کی پر تشدد، خونریز مخالفت اور منسوخی کے علاوہ مسلمانوں کی تحفظ حقوق کے لیے ۱۹۲۷ء کی دہلی تجاویز ٹھکرا دی گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ میں جو آئین مسودہ تیار کیا گیا اس میں مسلم قوم کے علیحدہ وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا گیا اور میثاق لکھنؤ میں طے شدہ جداگانہ انتخاب کا اصول کو بھی ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سائمن کمیشن کو ماننے سے انکار کیا گیا کہ ہندو کانگرس ہی انگریز کے جانے کے بعد فرمانروا ہو گی۔ صرف وہی تجاویز دے سکتی ہے۔ دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں سمجھوتے کے دس (۱۰) نکات کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ان نکات میں قائداعظم نے ترمیم کر کے چودہ نکات پیش کیے اور جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو واپس لینے کے باوجود قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اقبال کے الگ مسلم وطن کے خطبہ صدارت الہ آباد پر خلفشار برپا کر دیا کہ بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کیے جا رہے ہیں۔ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں لندن گول میز کانفرنسیں اور

تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندو کانگریسی قیامت مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا بہت ڈھنڈورہ پیٹتی ہے۔ مگر اس کا حال کڑک مرغی جیسا ہے جو کڑاک کڑاک کر کے شور تو بہت مچاتی ہے مگر اقلیت کے حقوق کا ایک انڈہ بھی نہیں دیتی۔

چونکہ مسلم لیگ کا مسلم آبادی کی نسبت سے مسلم سیٹوں کی تعداد اور جداگانہ انتخاب مانا جا چکا تھا۔ اور اقبال کے کلام نے قوم کی بیداری پر بڑا مثبت اثر ڈالا تھا۔ اور قائداعظم نے لیگ کی قیادت سنبھال لی تھی۔ جن پر قوم کا مکمل اعتماد تھا اور منظم قیادت کی تشکیل دے دی تھی۔ اس کے علاوہ قومی اخبارات میں زمیندار، احسان خاص کر نوائے وقت نے ہندو پریس کے جھوٹے پراپیگنڈہ کا منہ توڑ جواب دے کر عام مسلمانوں پر الگ آزاد وطن کی اہمیت واضح کر دی۔ نیز مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں نے اور کالج سٹوڈنٹس نے شہروں کی بستیوں کے علاوہ دیہاتی علاقوں میں گاؤں گاؤں جا کر انھیں مسلم لیگ کی اہمیت اور انگریزوں اور ہندوؤں کو غلامی سے آزادی کا مفہوم سمجھایا تو ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں دونوں فریقوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ کانگرس کا زعم تھا کہ وہ ۱۹۳۵ء کے الیکشن کی طرح دوبارہ مسلمانوں کی سیٹیں بزور یا بزر حاصل کر لے گی۔ مگر اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ مرکز میں ۳۰ مسلمان سیٹیں تھیں جو سب کی سب مسلم لیگ نے جیت لیں۔ ①

[گذشتہ سے پیوستہ]

گاندھی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوگئیں۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور کو طنز و تضحیک کا نشانہ کے طور پر قرارداد پاکستان کہا گیا جو تمام مسلمانوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں سر سٹیفورڈ کرپس کے وفد نے تجاویز رد کر دیں۔ شملہ کانفرنس میں آل پارٹیز میں سمجھوتہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ اور کیبنٹ مشن میں بھی ناروا رویہ اختیار کیا۔ ۱۹۳۵ء کے انتخاب میں کامیابی کے بعد کانگرس حکومتوں نے آل انڈیا کی سطح پر مسلمانوں پر ہر طرح سے ظلم و زیادتیاں کیں۔ اس بیان کردہ متعصبانہ غیر منصفانہ زیادتیوں جن میں مسلمانوں کو آئندہ غلام بنانے کے عزائم صاف ظاہر تھے۔ مسلمانوں کو ہوش آ گیا اور وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہوگئے۔ جو پاکستان کے وجود میں آنے کا سبب بن گیا۔ ورنہ اقبال خود باہمی اتحاد کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے حامی اور علمبردار تھے اور مخلوط حکومت کا انھیں خطرہ نہ ہوتا۔ اگر ہندو قیادت کی بدنیتی کو دیدۂ بینا سے دیکھ نہ لیتے۔

① مسلم لیگ از ایس ایم بشیر، ص ۸۷۔

لوکل باڈیز الیکشن میں کانگرس نے مسلم لیگ نمائندوں کے مقابل اپنے خریدے ہوئے یا کانگریسی مسلمان کھڑے کیے۔ سیالکوٹ جہاں میں کالج سٹوڈنٹ تھا وہاں مسلم لیگی نمائندے کے مقابل کانگرس نے ایک نیشنلسٹ مسمی یوسف بٹ کو کھڑا کیا اور اس کے لیے حمایت حاصل کرنے کے لیے بہت پیسہ خرچ کیا۔ مگر لیگی کارکنوں نے ایک ایسا نعرہ وضع کیا۔ جس سے اُس کی دونوں کی گنتی کے بعد ضمانت ضبط ہوگئی اور وہ نعرہ یہ تھا۔ یوسف بٹ چوڑ چوپٹ، قوم نوں ویچ کے پیسے کھٹ۔ اس نعرے کی گونج اور تال سے ہندوؤں کے دروازے، کھڑکیاں کھٹ کھٹ بند ہونے لگے۔

اس کے بعد صوبائی الیکشن میں بھی دونوں طرف سے بڑی زور آزمائی ہوئی۔ سیالکوٹ نے شیخ کرامت علی کو اپنا نمائندہ کھڑا کیا اس کے مقابلے میں کانگریس نے مجلس احرار کو جو کانگرس کی حمایت یافتہ جماعت تھی۔ اُس کا ایک چوٹی کا کیڈر مولانا مظہر علی اظہر کو مقابلے کا ٹکٹ دیا۔ مجلس احرار تحریک کشمیر کی وجہ سے خاصی مشہور تھی۔ پھر اُن میں مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری اور شورش کشمیری جیسے اور بھی کئی زبردست خطیب تھے مجلس احرار نے الیکشن کے لیے حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ وضع کیا۔ جو در و دیوار پر لکھا نظر آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ پاکستان زندہ باد" لے کے رہیں گے پاکستان" کا نعرہ لگاتی تھی.....

مرے کالج میں ریفریشمنٹ وقفے کے درمیان طالب علم اکٹھے ہو کر سیاست پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ ایک احراری نے سوال اٹھایا کہ ہم تو تحریک آزادی میں حکومتِ الٰہیہ کے داعی ہیں۔ مسلم لیگ کے پاکستان کا کیا مطلب ہے؟ وہیں نوجوان شاعر اصغر سودائی بھی موجود تھے انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ! یہ فی البدیہہ جواب موجود سامعین کے دل میں فوراً ایسا گھر کر گیا کہ تمام ملک میں کیا بڑے کیا چھوٹے سب کا ورد زباں بن گیا۔ اس نعرے نے حصول پاکستان میں بہت کام کیا جو آج بھی ویسا ہی زندہ و تابندہ ہے۔ (کیونکہ اصغر سودائی گولڈ میڈلسٹ اور راقم نے اکٹھے ۱۹۵۰ء میں ایم اے اکنامکس میں کامیابی حاصل کی تھی)۔ مگر سب سے دلنشیں نعرہ جو نمایاں الفاظ میں دیواروں پر لکھا نظر آتا وہ تھا "ہمارا مذہب اسلام"، "ہماری قوم مسلمان"، "ہماری زبان اُردو"۔ میرا خیال ہے کہ یک جہتی اور پاکستان کی روح ہے۔ جسے ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ اسے دوبارہ رائج کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ کلام اقبال کو قومی سطح پر مقبول

بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ جو ہماری اپنی زبان میں قرآنی تفسیر ہے۔ قصہ کوتاہ مولانا اظہر علی اظہر بری طرح ناکام رہے۔ اور ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں ۸۶ مسلم سیٹوں میں ۷۹ یعنی نوے فیصد لیگ نے جیت لیں۔ گویا مرکزی، صوبائی اور مقامی الیکشنوں کے نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ اکثریت کی بنا پر لیگ کو وزارت پنجاب بنانے کی دعوت دی جاتی مگر اسلام کو ہمیشہ سے غداروں کے ہاتھوں قومی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ یونینسٹ پارٹی اسلامی اتحاد پارہ پارہ کرنے کی وجہ سے جس کے اقبال سخت خلاف تھے ان کے لیڈر خضر حیات ٹوانہ نے ہندو سکھوں سے جوڑ توڑ کر کے وزارت بنا لی۔ اس صریحاً حق تلفی پر مسلمانوں کو سخت رنج ہوا۔ انھوں نے خضر وزارت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ تمام پنجاب میں احتجاج کے لیے مظاہرے ہوئے اور ہزاروں لیگیوں نے گرفتاری پیش کر دی۔ سیالکوٹ میں بھی خواص و عام نے گرفتاریاں دیں۔ روزانہ شہر کے مرکز میں حکومت کے خلاف مظاہرہ ہوتے۔ ایک دن مظاہرین اور کالج طلبا نے جیل کا رخ کیا جس میں راقم بھی شامل تھا اور تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ پولس کی بھاری جمعیت موجود تھی مگر روکنے کا کسی کو حوصلہ نہ ہوا۔ آخر حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور ۲ رمارچ ۱۹۴۷ء کو مستعفی ہو گئی اور پنجاب میں گورنر راج نافذ ہو گیا۔ ہندو اور سکھ جو خضر ٹوانہ کی حکومت کے پس پردہ سازشی کاروائی کر رہے تھے اب کھل کر سامنے آ گئے۔ ماسٹر تارا سنگھ جنونی سکھ لیڈر نے کرپان لہرا کر بول بلند کیا: "جو مانگے گا پاکستان، اس کو دیں گے قبرستان" اس کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا خونریز قتل عام شروع ہو گیا۔ یہ فسادات نہیں تھے بلکہ ہندو سکھوں کی سوچی سمجھی سازش کے تحت کھلی غارت گری تھی۔ جس میں مسلمانوں کی آبادیاں، کھیت جلا دیئے گئے۔ مسلمانوں کو مہاجرین کو بے سروسامان کے عالم میں پاکستان کی طرف قافلوں کی صورت میں پاپیادہ یا چھکڑوں پر رخ کرنا پڑا۔ تاکہ جانیں بچ جائیں اور کتنی عورتیں قتل و اغوا ہوئی اور عصمتیں لوٹی گئیں اس کا شمار نہیں۔

اب چونکہ حالات بالکل واضح ہو چکے تھے کہ ملک تقسیم ہو کر رہے گا تو نہرو، پٹیل اور گاندھی کو بھی کہنا پڑا کہ وہ پاکستان دیں گے مگر لنڈورا کر کے جو اتنا کمزور ہوگا کہ جلد ہی پیدا کردہ

مسائل کے ہاتھوں عاجز ہو کر ٹوٹ جائے گا اور دوبارہ اکھنڈ بھارت کا حصہ بن جائے گا۔ (۱)
۱۹۴۶ء کے الیکشنز کے نتیجہ سے کانگریس خوش نہ تھی اور وائسرے جنرل ویول کے خلاف تھی کہ اُس نے کانگریس کو من مانی کاروائی نہیں کرنے دی۔ چنانچہ انھوں نے برطانوی وزیر اعظم ایٹلی سے شکایت کر کے اُس کی جگہ لارڈ موئنٹ بیٹن (۲) کا تقرر کرالیا۔ یہ بھی ایک سازش تھی کیونکہ لیڈی اور لارڈ موئنٹ بیٹن سے جواہر لال نہرو کے دیرینہ گہرے مراسم تھے جس کا نہرو نے ہر طرح سے ناجائز فائدہ اٹھا کر پاکستان کو بے حد نقصان پہنچایا۔ ایک سازش یہ کی کہ دوسرے جنگ عظیم کے بعد ہندوستان پر حکومت جاری رکھنا حکومتِ برطانیہ کے مفاد میں نہیں تھا۔ اس لیے اس نے جون ۱۹۴۸ء (۳) تک ملک چھوڑنے کا ارادہ بتادیا۔ یہ سن کر نہرو نے موئنٹ بیٹن سے سازش کر کے ہندوستان سے جانے کا وقفہ ایک سال کم کرالیا تاکہ محض تین ماہ کے مختصر وقفہ میں قائد اعظم اور لیگ پر دباؤ ڈال کر مجوزہ معاہدے کی ضروری تفاصیل جاننے کا موقع دیے بغیر ایگریمنٹ کرالیا جائے۔ چنانچہ تقسیم ہند کا منصوبہ موئنٹ بیٹن نے نہرو کی مرضی کے مطابق بنایا جس میں بنگال اور پنجاب میں ہندو اکثریت والے علاقوں کی علیحدگی۔ سلہٹ اور صوبہ سرحد میں استصواب رائے، ریاستوں کو مرضی سے الحاق کا اختیار، کیونکہ راجہ کشمیر سے درپردہ ہندوستان سے الحاق کی سکیم طے ہو چکی تھی جس کی ۹۰ فیصد آبادی مسلم تھی۔ جملہ محکمہ جات کے اثاثہ جات کی تقسیم، باؤنڈری کمیشن کو حتمی فیصلہ کا اختیار۔ پنڈت نہرو نے یہ منصوبہ فوراً قبول کرلیا اور قائد اعظم ورفقا کو بتادیا گیا کہ یا یہ منصوبہ قبول کرلیں ورنہ کانگریس کو قیادت وحکومت کا کلی اختیار دے کر حکومت برطانیہ میں چلی جائے گی یا جیسا موئنٹ بیٹن (۴) اپنی مرضی کے مطابق جو فیصلہ کرے گا قبول کرنا پڑے گا۔

چنانچہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کو مجبوراً پہلا فیصلہ ماننا پڑا کہ اس میں پاکستان قائم کرنے کا واضح اعلان تھا۔ مگر باؤنڈری کمیشن جس کا ہیڈ ریڈ کلف تھا زیر اثر موئنٹ بیٹن اور نہرو کی

---

(۱) ایضاً،ص۹۰۔
(۲) ایضاً،ص۸۶۔
(۳) ایضاً،ص۹۰۔
(۴) ایضاً،ص۹۳۔

بدد یانتی سے پاکستان کو نہایت اہمیت کے مسلم اکثریت والے علاقوں سے محروم کر دیا خاص کر گورداس پور جو مسلم اکثریت کا ضلع تھا۔ کشمیر پر ناجائز قبضہ کرنے کے لیے گھوٹھ اور بٹالہ کا علاقہ ہندوستان کو دے دیا گیا۔ جو ہند سے کشمیر کو ملاتا تھا۔ فیروز پور ہیڈ ورکس دریاؤں کے پانی کو کنٹرول کرنے والا مقام ناجائز دے دیا گیا۔ بنگال میں مرشد آباد اور کئی مسلم اکثریت والے علاقے ہندوستان کے حوالے کر دیئے گئے۔ ہندوستان کے علاقے میں موجود مشترکہ اثاثوں کی تقسیم میں بڑی دھاندلی کی گئی۔ اور پاکستان کو بڑے حصے سے محروم کر دیا گیا تاکہ پاکستان کی انتظامیہ شروع میں بیٹھ جائے۔ اب تقسیم ہند کے نتیجہ میں ہندو تعصب کی بنا پر آبادیوں کا جو تبادلہ کرنا پڑا۔ اُس کا مختصر احوال صرف سیالکوٹ شہر تک محدود ہے۔ راقم نے جو دیکھا، قتل و غارت گری جس پیمانہ پر مشرقی پنجاب میں کی گئی۔ اس کا عشر عشیر بھی پاکستان علاقوں میں نہیں ہوا۔ اگر کہیں ایسا ہوا بھی تو وہ بھی مشرقی پنجاب کے واقعات کے ردعمل کے طور پر۔

سیالکوٹ صنعتکاروں کا شہر ہے۔ ہندو سرمایہ دار، صنعت کاروبار و تجارت پر غالب تھے۔ مسلمان عام طور پر متوسط یا غریب کاریگر ہنر مند تھے۔ تاہم یہ اقبال اور مولوی میر حسن کا شہر تھا۔ جو نہایت انسان دوست اور درد مند انسان تھے اس لیے یہاں کبھی مذہبی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ ۱۴ راگست سے کوئی دو ہفتے پہلے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا۔ سکول کالج کاروبار بازار بند ہو گئے۔ اس لیے کیا گیا کہ سیالکوٹ سے غیر مسلم آبادی کا انخلا بغیر فساد لوٹ مار کے ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تمام ہندو سکھ آرام سے ضروری سامان پیک کر کے کیمپوں میں پہنچا دیئے گئے جہاں سے ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔ مگر ۱۴ راگست سے ایک رات قبل کچھ شر انگیزوں نے اپنا کام کر دکھایا۔ رات کو ہندو علاقے کے کاروباری مقام سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے گئے۔ یہ بازار کلاں کہلاتا ہے جس میں ہندوؤں کی بڑی بڑی کپڑے، ہاوزری، جوتوں، جنرل سٹورز، کراکری صرافہ وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ۱۴ راگست کو کرفیو ٹوٹنے کے وقفہ میں لوگ ضروریات زندگی خریدنے کے لیے بازاروں کی طرف گئے تو دیکھا بازار کلاں کی تمام دکانیں جل کر راکھ ہو چکی تھیں حیرت ہوئی کہ سب ایک رات میں کون کر گیا؟

ادھر ریڈیو پر اعلان ہو رہا تھا یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ یہ ملک پاکستان ہے جو مسلمانوں کا

بن چکا ہے۔ اس کی چھوڑی ہر چیز ملک کی ملکیت ہے اس لیے کسی چیز کو ضائع نہ کریں نہ لوٹ مار کریں۔ ہوائی جہاز سے بھی نوٹس پھینکے گئے۔ تاہم ہندو طویل رہائشی علاقے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا جس میں آنے والے مہاجرین کو آباد کر دیا گیا۔ مہاجرین کے لیے وقتی طور پر کیمپ لگا دیا گیا جہاں نئی حکومت اور شہری تنظیموں نے ضرورت کی اشیا فراہم کیں۔ عجب درد انگیز مناظر تھے۔ راقم نے بھی محلے کی تنظیم کے کارکنوں کے ہمراہ مہاجر کیمپ میں خدمت کے لیے چند دن گزارے۔ مہاجرین اپنا سب کچھ لٹا آنے کے باوجود پاکستان پہنچنے پر پُر امید نظر آتے تھے کہ پاکستان میں اُن کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ ان دنوں ہر کام تعطل کا شکار تھا۔ نئی انتظامیہ آہستہ آہستہ نظم و نسق پر توجہ دے رہی تھی۔ اس دوران بعض موقع پرست خالی ہندو آبادی کے گھروں میں بچا کھچا سامان سمیٹنے میں لگے تھے۔ ایک دن راقم نے بھی ہندو آبادی کا چکر لگایا جہاں میرے دو ہندو دوستوں کی رہائش تھی۔ تمام آبادی کے دروازے کھلے پڑے تھے اور ھُو کا عالم خاموشاں کا منظر تھا۔ میں اپنے دوستوں کے گھر داخل ہوا تو سارا سامان اُلٹ پلٹ پڑا تھا چند کتابیں نظر آئیں۔ ایک نہرو کے متعلق اور دوسری مہا بھارت پر وہ اٹھا کر میں واپس لوٹ آیا۔

بہر کیف ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ ہندو، انگریزوں اور مخالفین کی زبردست مخالفت کے باوجود پاکستان معرضِ وجود[1] میں آ چکا تھا جس کے بارے میں قائد اعظم نے ریڈیو پر فرمایا: خدا کے فضل سے ہم نے آزاد وطن حاصل کر لیا ہے۔ اس میں وسیع اور قیمتی قدرتی وسائل ہیں جن سے ہم نے اپنی لگاتار محنت اور کوشش سے ملک کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہے۔ مگر بدقسمتی سے قائد اعظم ایک سال کے بعد ہی چل بسے۔ یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ ان کے بعد ملکی عنانِ حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ جو بڑے زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار، بیوروکریٹ تھے۔ جن میں کافی نااہل اور کرپٹ تھے جس وجہ سے ملک خاطر خواہ ترقی نہ کر سکا۔ جیسے دوسرے ایشیائی ممالک کر رہے ہیں کیونکہ پاکستان یقین، اتحاد، نظم و ضبط کی بنا پر بنا تھا۔ وہ انتشار، ذاتی مفادات، حصولِ زر اور جنگی فکر و عمل میں بدل گیا ہے۔ ہمیں اقبال اور قائد اعظم کے فرمودات کی روشنی میں اپنے عمل کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ہے:

---

[1] ایضاً، ص ۹۳۔

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا①

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں②

ورنہ انھوں نے قانونِ قدرت کے عمل کی تنبیہ کی ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف③

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص۳۱۶۔
② ایضاً، ص۱۹۱۔
③ ایضاً، ص۵۳۸۔

اقبال کی زندگی کے جمالیاتی پہلو- بے نیازی، فقر اور استغنا

علامہ اقبال کثیر الجہت، عظیم المرتبت شخصیت تھے اور آفاق گیر شہرت رکھتے تھے۔ وہ نابغۂ روزگار ہستی تھے۔ جو صدیوں بعد کرۂ ارض پر ظہور پذیر ہوئیں۔ وہ اپنی آفاقی، الہامی شاعری علومِ شرق وغرب میں وسیع دسترس، عالمانہ، متکلمانہ قوتِ خطاب، اعلیٰ درجہ کے قانون دان اور دیگر بے مثل صفات کی بنا پر عالمگیر شہرت کے ساتھ جو انھیں حاصل تھی۔ بے پناہ دولت کما کر شاہانہ طرزِ زندگی گزار سکتے تھے مگر وہ فطری اور موروثی طور پر درویشانہ، متوکل، بے نیاز قسم کا مزاج رکھتے تھے اور دنیاوی مال و دولت کو اسلامی اقدار کے مقابلے میں پرکاہ کی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ جب ان کے سامنے کتابِ ہدایت، رسولِ مقبول ﷺ کی والہانہ محبت ان کی سیدھی سادھی زندگی کا نمونہ موجود تھا تو وہ کیونکر دنیاوی مال وزر، جاہ ومنصب، تفاخر وتکبر کے فریب سود وزیاں کے شکار ہو سکتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے:

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی؟
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا①

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا②

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر③

---

① بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال، ص ۳۲۲۔
② ایضاً، ص ۳۲۳۔
③ ایضاً، ص ۳۳۹۔

وہ بطور ایک سچے مسلمان کے خدا کے عطا کیے ہوئے مقامِ بندگی جسے احسن الخالقین کہا گیا ہے۔ اس کے آگے مال و دولت کو ہیچ جانتے ہوئے اپنی باعمل درویشانہ بے نیاز استغنا سے معمور زندگی کو وہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا انعام سمجھتے تھے۔ جس کے اندر مقصدِ حیات کی تکمیل کے لیے عشق، جدوجہد، قوتِ تسخیر، تگ و تاز، عملِ پیہم، باہمی ہمدردی، محبت و دستگیری اور سوز و دردمندی کا ایک جہاں آباد ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (۱)

چنانچہ زیرِ غور مضمون میں اقبال کی شخصی زندگی کے ان پہلوؤں کا کسی حد تک احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے جس کا تعلق معاشرے میں رہتے ہوئے مال و دولت کی اہمیت کے باوجود باہمی تعلق و ربط، معاملاتِ زندگی، رہائش، خوراک، صحت اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے ضمن میں ان کی درویشانہ طبیعت، توکل، بے نیازی اور استغناء کا اظہار ہوتا ہے۔

اقبال نے وکالت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے قانون دان تھے۔ اپنی بے مثل ذہانت، فطانت، ذکاوت اور عقلمندانہ جوہر سے وہ وکالت کے ذریعے بے حد دولت کما سکتے تھے مگر ملک کے سیاسی حالات، مسلمان قوم کی زبوں حالی انھیں بیدار و متحد کرنے اور متعصب و شاطر مخالفین انگریز اور ہندو کانگریس سے قوم کے جائز حقوق حاصل کرنے کے سلسلہ میں وہ وکالت کو زیادہ وقت نہیں دیتے تھے اور ہر ماہ اگر پہلے ہفتے میں ۵۰۰/۶۰۰ روپے کی فیس حاصل ہو جاتی جن سے گھریلو اخراجات پورے ہو جاتے تو باقی مہینہ وہ کیس لانے والوں سے معذرت کر دیتے۔ (۲) ایسی مالی منفعت سے بے نیازی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ایک ہندوستانی مصنف ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنی کتاب اقبال شاعر اور سیاستدان میں لکھا ہے کہ:

ایک ممتاز ہندو قانون دان اور اعلیٰ ترین کانگریسی رہنما سی۔ آر۔ داس نے اقبال کو پٹنہ کے ایک مقدمے میں ماہرانہ شہادتی بیان تیار کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ جس میں عربی، فارسی

---

(۱) بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال، ص ۳۰۶۔

(۲) فقیر سید وحید الدین روزگارِ فقیر، حصہ اول، ص ۲۲۲۔

دستاویزات کا ترجمہ بھی عدالت کو پیش کرتا تھا۔ اس کیس کی تیاری کے لیے اقبال کو فرسٹ کلاس کرایہ، نہایت اعلیٰ جائے قیام وطعام اور ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس کی تجاویز پیش کیں کہ وہ کیس کی تکمیل کے لیے دو ماہ تک پٹنہ میں قیام کر سکتے ہیں۔ اقبال نے سی۔ آر۔ داس سے فائل طلب کی اور جن سوالات کے جوابات تیار کرنے تھے وہ ایک ہی رات میں تیار کر کے دستاویز اگلی صبح عدالت میں پیش کر دی۔ فریق ثانی ممتاز کانگریسی رہنما وکیل موتی لال نہرو تھا، اقبال کا بیان واضح اور مکمل تھا۔ موتی لال نہرو کو اقبال سے جرح کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ چنانچہ عدالتی کاروائی ایک روز میں ختم ہو گئی اور اقبال صرف ایک ہزار روپیہ وصول کر کے لاہور واپس آ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آٹا ایک روپے کا بیس سیر ملتا تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ ساٹھ ہزار کی رقم آج کل کے حساب سے خطیر رقم بنتی ہے جو اقبال نے حصولِ زر کی بجائے انتہائی دیانت وایمانداری کے اصولوں پر قربان کر دی۔ (۱)

اس زمانہ میں اقبال کے ایک دوست علی امام جو مہاراجہ الور سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اقبال کو مہاراجہ کا پرائیوٹ سیکرٹری مقرر کرنے کا پرکشش مشاہرے پر انتظام کیا اقبال الور گئے۔ مہاراجہ سے ملاقات کی اور بغیر ملازمت قبول کیے واپس آ گئے۔ کیونکہ ریاست میں رائج نظام اور مہاراجہ کی شخصی حیثیت کے احکام کی تکمیل اقبال کے مزاج کے موافق نہ تھی۔ اقبال کو اپنی آزادی عزیز تھی۔ اس لیے وہ مالی فائدہ کی خاطر ان مطالبات کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ جو شاہی ملازمت ان پر مسلط کر دیتی۔ (۲)

کچھ اس طرح کی مجبوری سے آزادی کی خاطر اقبال نے گورنمنٹ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا۔ حالانکہ ہائیکورٹ نے ان کے علمی مرتبے کو دیکھتے ہوئے انھیں مراعات دی تھیں کہ ان کے مقدمات کو کالج کی کلاسوں کے بعد سماعت کیا جائے۔ تاہم اقبال کا ذہن فطری طور پر ملازمت کو بخوشی قبول نہیں کرتا تھا۔ دوسرے انگریز پرنسپل کا رویہ ماتحت ومحکوم قوم کے اساتذہ سے وقار کے منافی تھا۔ مخلص احباب نے اقبال کے اس اقدام کو نہ سراہا۔ مگر اقبال کے نزدیک یہ زیادہ ضروری تھا۔ کیونکہ سرکاری ملازمت میں رہ کر قوم کی بیداری اور آزادی کے

---

(۱) ڈاکٹر رفیق زکریا، اقبال بحیثیت شاعر اور سیاستدان، بک ہوم، مزنگ روڈ لاہور، ص ۷۱۔

(۲) ایضاً، ص ۷۱۔

لیے اپنے کلام میں آزادانہ جذبات و خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ ①

انگریز حکومت کا طریقہ تھا کہ والیانِ ریاست کے ساتھ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے انگریز ریذیڈنٹ مقرر کر دیتی جو ریاستی نواب یا مہاراجہ کو پابند رکھتا۔ نواب آف بہاولپور صادق عباسی کو اپنے ریذیڈنٹ سے دخل در معقولات کی بہت شکایت تھی۔ انھوں نے اقبال کو اس مسئلے کے لیے وکیل منتخب کیا۔ اقبال نے اپنے مضبوط دلائل اور زورِ بیان سے وائسرے کو قائل کر کے وزیرِ اعظم کو تبدیل کرا دیا وائسرے کو اقبال کے علمی مرتبے اور "سر" کے خطاب یافتہ ہونے کا علم تھا اس نے درخواست کی کہ پرسوں میرے ساتھ ڈنر کریں۔ اقبال نے کہا کہ مجھے تو آج ہی واپس جانا ہے۔ وائسرائے نے کہا کہ اچھا کل سہی۔ اقبال نے کہ اگر آپ کی خواہش ہے تو آج ہی کر لیجیے۔ وائسرائے نے ان کی بات مان لی علامہ کو دوسرا کمرہ آرام کے لیے دیا اور دوپہر کا کھانا کھا کر اقبال اسی دن واپس لوٹ آئے۔ ②

نواب بہاولپور کا یہ کام معمولی نہ تھا۔ جو اقبال نے حسنِ تدبیر سے کر دکھایا۔ چنانچہ نواب نے اقبال کا شکریہ ادا کرنے اور خصوصی انعام و اکرام عطا کرنے کے لیے بذریعہ تار انھیں بہاولپور بلا بھیجا مگر اقبال کی درویشانہ اور بے نیاز طبیعت نے گوارا نہ کیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی بجائے معذرت کر دی جو ایک مردِ قلندر، مستغنی اور درویش صفت انسان ہی کر سکتا ہے ان کا یہ شعر اس جذبے کو حضور رسالت مآب میں اس طرح اظہار کرتا ہے۔ ③

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو (ﷺ) شاخِ نشیمن بھی تو (ﷺ) ④

اقبال انجمنِ حمایتِ اسلام کو مسلمانوں کی تعلیم و تنظیم و اشاعت کا مرکز سمجھتے تھے۔ انجمن سے ایک مرتبہ تعلق قائم ہوا تو مرتے دم تک منقطع نہ ہوا۔ انھوں نے پہلی بار اپنی نظم "نالۂ یتیم" ۱۸۹۹ء میں سٹیج پر پڑھی۔ انجمن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اقبال نے اپنی مشہور ترین نظمیں مالی منفعت کے بغیر سٹیج پر پڑھیں اور سامعین سے انجمن کے فنڈ میں خطیر اضافے کا باعث بنیں۔ ⑤

---

① روزگارِ فقیر، حصہ دوم، ۱۵۶۔
② نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون اقبال کی شخصیت از حکیم محمد یوسف، ص ۴۴۱۔ ۴۴۲
③ ایضاً، ص ۴۴۳۔
④ بالِ جبریل اردو، ص ۹۱۔
⑤ روزگارِ فقیر، جلد اول، ص ۲۲۶۔

اقبال کافی سال انجمن کے صدر بھی رہے مگر علالت کے باعث آخری بار ۱۹۳۶ء میں انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ وفات سے قبل اپنا ذاتی کتب خانہ جو ان کی زندگی کا اثاثہ اور سرمایہ تھا۔ عطیہ کے طور پر انجمن کو نذر کر دیا۔ ①

اقبال کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ آخری سالوں میں شدید علالت کے باعث تمام مالی ذرائع مسدود ہو چکے تھے سر راس مسعود سر سید کے پوتے اقبال کے مخلص دوست اور شیدائی تھے۔ ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی سعیٔ جمیلہ سے نواب بھوپال اور سر آغا خان نے ۵۰۰،۵۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ کی پیش کش کی اقبال نے نواب بھوپال کے وظائف کو تو قبول کر لیا کہ میں، قرآن حکیم کی شرح جس کی جدید زمانے کے تقاضوں کے تحت بے حد ضرورت ہے، لکھوں گا، اگر عمر نے وفا کی تو۔ مگر آغا خان کے وظیفہ سے معذرت کر لی کہ میں سادہ زندگی کا عادی ہوں۔ نواب بھوپال کا وظیفہ ہی کافی ہے۔ ان کی یہ سیر چشمی یقیناً قرونِ اولیٰ کے مومنوں اور صوفیاء و اولیاء کی زندگی کے مطابق تھی۔ جو فقر و استغنا کی اعلیٰ مثال ہے۔ ②

جب نادر شاہ افغانستان میں بچہ سقہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ملک میں امن و امام قائم کرنے بیرونِ ملک سے آیا تو اقبال اسے ملنے لاہور ریلوے اسٹیشن پر گئے اور اپنی تمام جمع پونجی جنگی اخراجات کے لیے اسے پیش کر دی جو معمولی رقم ہی سہی مگر مومنانہ جذبہ کی تحت تھی۔ حالانکہ اقبال مشکل سے آمدنی سے زائد رقم جمع کرنے کی حالت میں تھے مگر یہ جذبہ نہ صرف لائقِ تحسین تھا بلکہ قابلِ تقلید بھی۔

حیدر آباد دکن کے وزیر سر اکبر حیدری سے اقبال کے دوستانہ مراسم تھے۔ انھوں نے اقبال کی علالت اور معاشی حالات کے پیشِ نظر ایک ہزار روپے کا چیک مدد کے لیے ارسال کیا اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ یہ رفاہِ عام کے فنڈ سے دیا گیا ہے جس کا وہ ناظم ہے اقبال نے دوستانہ دستگیری کی بجائے ایسے فنڈ سے امداد لینا غیرت کے منافی سمجھ کر چیک لوٹا دیا اور ساتھ ہی چار اشعار کا قطعہ معذرت کے طور پر لکھ دیا۔ ③ جس کا آخری شعر یوں ہے:

---

① ایضاً، ص ۲۲۷۔

② ایضاً، ص ۸۹۔

③ کلیاتِ اقبال اردو، ص ۶۹۰۔

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ

اس احساس کے تحت وہ جائز و ناجائز کے متعلق بہت محتاط تھے وکیلوں کے پاس موکل عام طور پر تحائف و ہدیہ لایا کرتے ہیں جو فیس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ علامہ کو ان تحائف کو قبول کرنے میں بھی تامل تھا۔ چنانچہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو اس بارے میں وضاحت کے لیے لکھا ہے کہ کیا ایسے تحائف وکلاء کے لیے حلال ہیں؟

اقبال اپنی آمدنی کے حساب و کتاب میں نہایت احتیاط اور توجہ کرتے تھے اور جن ذرائع سے بھی آمدنی ہوتی تھی انھیں بلا کم و کاست آمدنی کے گوشوارے ظاہر کر دیتے تھے اور قانون کے مطابق ٹیکس ادا کرنے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ مشہور مورخ ڈاکٹر صفدر محمود نے اقبال کے ٹیکس گوشواروں کی تمام سالوں کی تفصیل محکمہ ٹیکس سے لے کر شائع کی ہے وہ کہتے ہیں کہ انکم ٹیکس آفیسر اگر مزید ٹیکس غلط بھی لگاتا تو اقبال ادا کر دیتے۔ اس کے خلاف کبھی اپیل نہ کرتے۔ اگرچہ اس کے منظور میں ہونے کوئی شبہ نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ معمولی فائدہ کے لیے اپیلوں میں وقت ضائع کرنا قومی ضیاع سمجھتے تھے۔ ①

اقبال کی پہلی بیوی جس کا تعلق گجرات سے تھا۔ مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب نباہ نہ ہو سکا نتیجتاً وہ زیادہ عمر اپنے میکے میں رہی۔ اقبال نے وفات تک ماہانہ نان نفقہ میں کبھی تاخیر نہ کی نہ ہی اقبال نے طلاق دی اور نہ بیوی نے خلع کی کوشش کی۔ الگ رہ کر خاموشی سے شرعی تقاضے نبھاتے رہے۔

پہلی بیوی سے علیحدگی کا خلا قدرت نے یکے بعد دیگرے دو بیگمات سے پُر کر دیا۔ جن سے اقبال کے تعلقات ان کی عمر کے اخیر تک نہایت خوشگوار رہے۔ دونوں بیگمات بہنوں یا سہیلیوں کی طرح رہتیں۔ اقبال بھی دونوں سے یکساں سلوک کرتے تھے اور دونوں کے لیے ایک جیسی اشیاء خریدتے۔ ایک دفعہ دونوں کے لیے ایک جیسا زیور بنوایا تو ایک کا زیور چند ماشے کم رہ

---

① ڈاکٹر جاوید اقبال بحوالہ مندرجہ ٹیکس تفصیلات از ڈاکٹر صفدر محمود ص ۱۸۸۔۱۸۹۔

گیا اقبال نے کم وزن کی قیمت اس کی بیوی کو نقد دے دی۔ تاکہ کسی سے بے انصافی نہ ہو۔ (۱)

اقبال نے اپنی کوٹھی میو روڈ (اب اقبال روڈ) پر ۱۹۳۵ء میں بنوائی۔ جس کی تعمیر کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی عطا محمد نے قبول کی۔ جو ریٹائرڈ انجینئر تھے۔ اقبال کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ دوران تعمیر انھوں نے ایک بار بھی تعمیر ہوتی ہوئی عمارت کو نہیں دیکھا (۲) جب کوٹھی تیار ہو کر مکمل ہو گئی تو اقبال نے اسے اپنے بیٹے جاوید اقبال کے نام ہبہ کر دیا۔ (۳) اس میں اپنے تصرف کے لیے جو تین کمرے رکھے اس کا کرایہ باقاعدگی سے ہر ماہ پر ۲۱ تاریخ کو جاوید اقبال کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے۔ اقبال کی وفات بھی ۲۱ اپریل کو ہوئی۔ اس لیے ان کے ذمے ایک دن کا کرایہ بھی قابلِ ادا نہ تھا۔ (۴)

ایک دفعہ ایک درویش اقبال کے پاس آیا۔ آپ نے حسب عادت اس سے دعا کی درخواست کی۔ درویش نے پوچھا دولت چاہتے ہو؟ اقبال نے جواب دیا میں درویش ہوں

---

(۱) بیگمات سے عادلانہ سلوک، روزگارِ فقیر، جلد دوم، ۱۸۹۔
اس کے علاوہ الحاج محمد حسین گوہر گولڈ میڈلسٹ کی تصنیف یادگارِ اقبال میں مرقوم ہے۔ میں نے بہت کم لوگوں کو علامہ اقبال جیسا خوش معاملہ پایا ہے۔ وہ روپے پیسے کے معاملہ میں بے حد دیانتدار اور ایماندار تھے۔ پہلی بیگم کو جتنی ماہوار رقم کا عہدہ کیا تھا نہایت پابندی سے تادمِ مرگ ادا کرتے رہے۔ لدھیانہ والی مختار بیگم اور والدہ جاوید اقبال سردار بیگم بیک وقت علامہ کے ہاں رہیں۔ لیکن ان کے درمیان کبھی سوکناپے کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ بالکل بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ علامہ خود بھی دونوں کے درمیان انتہائی عدل مدِ نظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے دونوں بیگمات کے لیے دو ایک جیسے زیور بن کر آئے۔ جب سنار نے ان کو تولا تو ایک زیور دو ماشے کم نکلا۔ علامہ نے دو ماشہ سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ متعلقہ بیگم کو ادا کر دی تاکہ بے انصافی کی شکایت نہ ہو۔ ص ۴۳۔

(۲) نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون عبدالعزیز مالواڈہ، (علامہ دوران تعمیر ایک دفعہ کوٹھی میو روڈ دیکھنے نہیں گئے)۔ ص ۶۲۵۔

(۳) نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون م۔ش۔ تعمیر کے بعد میو روڈ والی کوٹھی جاوید اقبال کے نام ہبہ کر دی۔ اپنے زیرِ استعمال حصہ کا کرایہ ہر ماہ ۲۲ ماہ اپریل کو جاوید اقبال کے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے۔ علامہ کی وفات ۲۱ اپریل کو ہوئی۔ اس طرح ایک دن کا کرایہ بھی واجب الادا نہ رہا۔ ص ۳۵۳۔

(۴) محمد حسین گوہر، یادگارِ اقبال، نظریہ پاکستان اکیڈمی، لاہور، ص ۶۸-۶۹۔

دولت کی ہوس نہیں۔ تو کیا عزو جاہ مانگتے ہو؟ اقبالؒ نے جواباً کہا کہ وہ بھی خدا نے کافی عطا کی ہوئی ہے۔ پوچھا تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟ جواب دیا۔ سائیں جی کیا کہہ رہے ہو؟ وہ خدا، میں بندہ۔ بندہ خدا سے کیسے مل سکتا ہے؟ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ نابود ہو جاتا ہے۔ میں قطرے کی حیثیت میں ہی دریا بننا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر درویش جھوم اٹھا، بولا: بابا جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ تو خود آگاہ راز ہے تجھے میری دعا کی کیا ضرورت؟ اقبال کے شعر یاد آ گئے ہیں۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ ①

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش ②

علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی خاصی بوسیدہ تھی جس کا وہ ۲۰۰ روپے کرایہ دیتے تھے۔ دوست احباب کہتے کہ کوٹھی کی حالت کے مدِ نظر کرایہ زیادہ ہے۔ اقبال جواب دیتے کہ یہ کوٹھی ایک ہندو بیوہ کی ہے جس کے یتیم بچے بھی ہیں اور اس کا یہی ذریعہ معاش ہے جس میں کمی کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

اسی طرح انارکلی والے مکان کا مالک بھی ہندو تھا جو ہر روز بڑی انکساری سے علامہ کو پرنام کرتا۔ علامہ نے استفسار پر بتایا کہ مالک مکان مجھے بڑا دھرماتما سمجھتا ہے کیونکہ اسے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو باقاعدگی سے کرایہ مل جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ ایک کرایہ دار ہمیشہ عین یکم تاریخ کو ایڈوانس کرایہ دے دیتا ہے۔

مذکورہ میکلوڈ روڈ والی بوسیدہ کوٹھی ایک ہندو بیوہ کی ملکیت ہونے کے سبب نہ کرایہ کم کراتے اور نہ مرمت کرنے کو کہتے۔ ان کے ایک دوست نے کہا کہ بیٹھک میں دیوار پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر ٹیڑھی آویزاں ہے۔ اگر آپ کو انگلش سرکار سے اتنا لگاؤ ہے تو ملکہ کی تصویر کو تو سیدھا لٹکا دیں۔ اس پر اقبال نے کہا کہ تصویر ہٹا کر دیکھو تو معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے دیوار پر

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۴۳۔

② ایضاً، ص ۱۸۹۔

سے پلستر اکھڑا ہوا تھا جسے چھپانے کے لیے ملکہ کی تصویر کا سہارا لیا گیا تھا۔[۱]

آپ کے بھتیجے اعجاز احمد کا بیان ہے کہ اقبال کو وکالت کرتے ہوئے دس سال گزر گئے تو انھوں نے اپنے والد کو خط میں لکھا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل و کرم کرے تو میں اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہیں اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد عطیہ ہے جس میں میری محنت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اسے خلق اللہ کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے۔ لیکن ان کی گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک ہونے، قومی مسائل اور اسمبلی کی مصروفیات کی وجہ سے وکالت ختم ہونے سے کسی کے دستِ نگر ہونے سے بچنے کے لیے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔[۲]

ایک بار تجویز ہوا کہ اقبال کے نام پر فوجی سکول قائم کیا جائے۔ علامہ نے تجویز پیش کی کہ شاعر کے نام سے فوجی سکول قائم کرنا مناسب نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اس کا نام ٹیپو فوجی سکول رکھا جائے جو تسلیم کر لیا گیا۔ گویا اقبال کی سرشت میں یہ بات تھی کہ وہ نام و نمود اور مال اور دولت کو ذرہ برابر بھی وقعت نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے تمام عمر ذہنی، جسمانی، وجدانی محنت کی۔ درویش و قلندر کہلوانا پسند کیا۔ خودداری اور عزتِ نفس کے اصولوں پر کبھی سمجھوتا نہ کیا۔ سرمایہ داری[۳] نظام کے وہ ویسے ہی بہت خلاف تھے کہ یہ استحصالی نظام ہے۔ ان کی شاعری سرمایہ داری نظام کے خلاف اشعار سے بھری ہوئی ہے کہ یہ انسانیت کش ہے۔ مفلس، مزدور چھوٹے کسانوں، مزارعوں کا استحصال کرنا ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کر کے انسانیت کا خون کرتا ہے۔ جیسا انھوں نے فرمایا:

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

سرمایہ داری نظام کو وہ بظاہر مہذب قانونی طریقوں سے دھوکہ فریب کہتے ہیں:

---

۱ نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون عبدالعزیز مالواڈہ، ص ۴۲۳۔
(محمد حسین گوہر، یادگار اقبال، ہندو بیوہ کی کوٹھی کا زاہد کرایہ)

۲ روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۱۶۹۔

۳ ایضاً، ص ۱۹۳۔

اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تُو؟
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو؟ ①

مال و دولت سے بے نیازی کے بیان کے بعد اقبال کی روزمرہ کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ روزمرہ کے معاملات خوراک، رہائش لباس، میل ملاقات، اخلاقیات وغیرہ کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی زندگی ایک درویش اور قناعت پسند انسان کی تھی۔ جس میں سادگی، نمود و نمائش، تصنع، بناوٹ سے قطعاً لاتعلقی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ ہر طرح سے ایک سادہ مزاج، متوکل انسان کی طرح جو بے عملی کی بجائے عمل والا توکل اور صبر و شکر کا نمونہ تھے۔ آفاق گیر شہرت کے باوجود ان میں تکبر و نخوت نام کی نہ تھی۔ ملاقاتیوں سے وہ کوئی امتیاز نہیں برتتے تھے۔ ان کا در دل اور مجلس کے دروازے سب پر یکساں کھلے تھے۔

دوست احباب، نامور عالم، عہدیداران، طالب علم، ان پڑھ، مزدور، تانگے والا، خوانچہ فروش سب کے لیے اذن عام تھا۔ جو آتا ادب سے سلام کر کے بیٹھ جاتا۔ کوئی بات کرتا تو آپ پوری توجہ سے سنتے۔ کوئی مسئلہ ہو تو سب کے سامنے حل بتاتے۔ اکثر پہلے سے نہ جاننے والے پہلی بار آتے تو اس عظیم شخصیت کو نہایت سادہ لباس مثلاً گرمیوں میں کنی والی دوہری دھوتی، بدن پر نیم بازوؤں والی بنیان میں ملبوس اور سردیوں میں اسی لباس یا شلوار قمیض پر کمبل لے کر سب سے بے تکلفی سے مشغول گفتگو دیکھ کر حیران ہو جاتے کہ یہی علامہ، ڈاکٹر، بارایٹ لا، سر محمد اقبال ہیں۔ جنھیں شاعر مشرق، ترجمانِ حقیقت، مصورِ فطرت، دیدہ ور، دانائے راز کہا جاتا ہے۔ ② جنھیں شان و شوکت، اعلیٰ مراتب، شہرت و خطابات کی چنداں خواہش نہ تھی۔ ان کی شہرہ آفاق مثنوی اسرار خودی اور اعلیٰ شاعری کے اعتراف و تحسین کے طور پر گورنر کی طرف سے سر کے خطاب کی پیش کش کو طوعاً و کرہاً اس لیے قبول کیا کہ اس میں مسلم قوم میں کسی صاحب علم کے ہونے کا اعتراف پایا جاتا ہے اور جس سے دوسرے بھی حصولِ علم، تصنیف و تحقیق کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ③

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ۳۶۲۔
② نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون خواجہ عبدالوحید، ص ۳۸۵۔
③ عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، اظہر سنز پرنٹرز، لٹن روڈ لاہور، ص ۱۲۹۔

گورنر نے دوسرے خطاب "شمس العلماء" کے لیے نام تجویز کرنے کو کہا تو اقبال نے شرط لگائی کہ ان کے تجویز کردہ نام کے بعد کسی اور نام پر غور نہیں کیا جائے گا۔ گورنر نے اتفاق کیا تو اقبال نے اپنے استاد مولوی میر حسن صاحب کا نام لیا۔ گورنر نے ان کی شہرت اور تصنیف کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ ان کی زندہ تصنیف میں خود آپ کے سامنے موجود ہوں۔ پھر اقبال نے یہ شرط لگائی کہ ان کے ضعیف استاد کو یہ اعزاز ان کے گھر پہنچایا جائے۔ ①

نام ونمود سے بے نیازی کی بناء پر مشاعروں میں شرکت، شعر خوانی پر داد کی طلب، صدارت کرنا، اپنے اشعار کی بلا مقصد اشاعت وشہرت کے مطلقاً خواہش مند نہ تھے۔ بلکہ اکثر بڑے قریبی تعلق یافتہ، مقربین، ارباب اختیار کے موقع بے موقع اشعار سنانے پر معذرت کر دیتے کہ اس سے عامیانہ پن اور درباری انداز ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے وقار مجروح ہوتا ہے۔ انھوں نے شعر گوئی کے لیے نواب رامپور، نواب جونا گڑھ، راجہ سر ہر کشن پرشاد، جوش ملیح آبادی جیسے اشخاص کو معذرت کر دی۔ اگر کوئی بلا اجازت ان کے اشعار چھاپ دیتا تو اس کا سختی سے نوٹس لیتے۔ غرض یہ کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنی خواہش کے مطابق اقبال کو شعر خوانی پر آمادہ کرے۔ ہاں احباب خاص کی محفل ہو، حالات کا تقاضا ہو اور اشعار کی آمد ہو تو لگا تار اشعار سناتے اور لکھواتے۔ ②

اس طرح کسی کو شاگردی میں نہیں لیتے تھے اور نہ استاد ہونے کی شہرت کے خواہاں تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے کلام کی اصلاح کرنے کی درخواست کی تو کہا کہ یہ بے پیر فن ہے یعنی قدرت خود ہی شاعر بنا دیتی ہے۔ اگر کسی میں جوہر قابل ہو تو تمھارا کلام ظاہر کرتا ہے کہ تم اچھے شاعر کے اوصاف رکھتے ہو۔ اس لیے مشق جاری رکھو۔ منزل پالو گے۔ ویسے اوزان کی کتاب اور دو استادوں کے نام بتا دیے۔ جس پر عبدالمجید سالک نے عمل کیا۔ اقبال کی متکلمانہ صفت مسلّم تھی۔ محفل میں کوئی سا بھی موضوع ہو وہ اس طرح برجستگی اور روانی سے اور مصدقہ حوالوں سے گفتگو میں ایسے گوہر تابدار نچھاور کرتے گویا پہلے سے ہی اس موضوع کے لیے تیاری کی ہو۔ دلائل اور خیالات کا دریا ہوتا جو امڈتا ہوا نظر آتا اور ان کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی۔ ③

---

① ایضاً، ص ۱۱۹۔
② ایضاً، ص ۳۲۵-۳۲۶۔
③ نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون عبدالسلام خورشید، مہر و سالک و اقبال، ص ۵۲۷۔

ایک دفعہ انگلستان میں قیام کے دوران ایک محفل مذاکرہ میں موضوع تھا "Life After Death" شرکا نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا وہاں اقبال کے استاد سر تھامس آرنلڈ بھی تھے۔ انھوں نے اقبال کو بھی دعوتِ کلام دی جواب میں اقبال نے صرف ایک جملہ کہہ کر محفل کو سمیٹ دیا۔ جو یہ تھا:

Life is beginning of death and death is beginning of life.①

اس رنگ میں اقبال کا ایک شعر بھی ہے کہ:

موت کو کہتے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

اقبال کی زندگی نام و نمود کی بجائے ملت کی بہتری و بہبود کے لیے وقف تھی مگر لاہور کے خواص و عام چاہتے تھے کہ اقبال اسمبلی میں منتخب ہو کر قوم کو فیضیاب کریں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے لاہور ارائیں برادری کے معروف نمائندے میاں عبدالعزیز مالواڈہ نے ان کے حق میں اپنا نام واپس بھی لے لیا۔ چنانچہ اقبال کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور یہ اعلان کیا کہ پچیس سال تک میں نے قوم کی کلام سے خدمت کی ہے کہ وہ ناامیدی اور کم ہمتی کو چھوڑ کر اسلاف کے نقشِ قدم پر عملی زندگی کو اپنائیں۔ اب میں زیادہ موثر طریقے سے آپ کی خدمت کے لیے خود کو ممبری کے لیے پیش کرتا ہوں۔ ممبر کا سب سے بڑا یہ وصف ہونا چاہیے کہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کر دے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اپنے ذاتی مفاد کو قوم کی اصلاح کے مقابلے میں ہرگز ترجیح نہیں دوں گا۔ میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس کی توفیق بخشے۔ میں اغراضِ ملی کے مقابلے میں ذاتی خواہشات کو فوقیت دینا موت سے بدتر خیال کرتا ہوں۔② اور واقعی یہ ممبری قوم کے لیے بڑا ایثار تھی۔ کیونکہ انھوں نے انتھک محنت سے ایسے قوانین پاس کرانے کی کوشش کی جن سے عوام، محنت کشوں، غریبوں اور کسانوں کو بہت فائدہ ہوا۔ اگرچہ اس قدر توجہ اور محنت سے ان کی وکالت جو ان کی اصل آمدنی کا ذریعہ تھی بالکل ٹھپ ہو گئی۔ اور وہ بڑی مالی مشکلات میں گھر گئے۔ اقبال کے مقابلے میں آج کل کے نمائندگان الیکشن کا

---

① ایضاً، خواجہ عبدالوحید، اقبال کے حضور، ص ۳۸۵۔

② ایضاً، محمد عبداللہ چغتائی، انتخاب لیجسلیٹو کونسل، ص ۳۶۹۔

خیال کریں جو نام تو قوم کی خدمت کا لیتے ہیں مگر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے ہیں اور ملک کی اقتصادی اور معاشرتی حالت تباہ کر رہے ہیں۔

علامہ عام طور پر پنجابی میں گفتگو کرتے حاضرین زیادہ تر پنجابی ہوتے تاہم حسب موقع اردو اور ضرورت کے تحت انگریزی میں بھی موضوع کی وضاحت اور سوال کی مناسبت سے حوالے دیتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مزاج میں علمیت اور لیاقت کو مشتہر کرنے کا مادہ نہیں تھا۔ وہ بے تکلف ایسی زبان بولتے جسے سامعین آسانی سے سمجھ لیں۔

حاضرین میں کچھ ایسے حضرات بھی ہوتے جو خاص مقصد کے تحت بڑی نیاز مندی کا اظہار کرتے مگر ان کا کام مخالفین تک خبریں پہنچانے کا ہوتا۔ علامہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس نیاز مندی کے پیچھے کیا ہے؟ اور مخبروں پر بالکل ظاہر نہیں کرتے تھے کہ وہ ان کے آنے کا مقصد جانتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ ان کے روزگار کا معاملہ ہے۔ اور علامہ کسی کو بے روزگار دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے اخبار نویس جو نام بدل کر ان کے خلاف زہر اگلتے۔ اقبال نے "مخلص منافق" کا نام دے رکھا تھا۔ بعض لوگ بلا وجہ بھی بیٹھے رہتے مگر علامہ سب کی موجودگی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور کسی کی دل آزاری نہ کرتے تھے۔ ①

حقیقت یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال کو نامور انگلش سکالر ڈاکٹر جانسن کی طرح ان کی گفتگو کے جواہر پاروں کو قلمبند کرنے والا اور ڈاکٹر باسویل کی طرح کا رفیق مل جاتا تو اقبال کی علمی شہرت کہیں زیادہ ہوتی۔ جو اُن کی آفاقی شاعری کی وجہ سے تھی۔ مگر ان کی طبع فقر شہرت کی خواہش سے بے نیاز تھی۔ تاہم حضور اکرم ﷺ کی نگاہِ کرم کے طفیل انھیں زندگی میں ہی بین الاقوامی شہرت عطا ہو گئی۔ جس کا اظہار وہ اپنی سوز و محبت سے لبریز خوبصورت نعت کے ایک شعر میں یوں کرتے ہیں:

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو ﷺ نے طلوعِ آفتاب ②

---

① ایضاً، خواجہ عبدالوحید، اقبال کے حضور، ص ۳۸۶۔

② کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۰۵۔

اقبال کی نمود و نمائش شہرت، ہوسِ اقتدار سے بے نیازی کے بارے میں ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پنڈت جواہر لعل نہرو اقبال سے ملاقات کے لیے آئے۔ ان کے ہمراہ میاں افتخار الدین بھی تھے جو اس وقت کانگرس میں تھے۔ دوران ملاقات میاں افتخار الدین نے پنڈت نہرو کے ایما پر اقبال سے کہا کہ اس وقت جو ہر دلعزیزی اور احترام مسلمان قوم میں آپ کی جملہ صفات کی وجہ سے ہے وہ کسی اور کے لیے نہیں۔ تو آپ کیوں نہیں مسلم لیگ کی سربراہی اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ آپ کی سیاسی بصیرت اور معتدل مزاج کی وجہ سے کانگرس اور مسلم لیگ میں تحریک آزادی کے لیے آسانی سے مشترکہ لائحہ عمل تیار ہو سکے گا۔ جو محمد علی جناح کے ساتھ ممکن نہیں۔ جن کے مزاج میں زیادہ سختی ہے۔

اقبال فوراً سمجھ گئے کہ یہ دونوں میرے اور قائداعظم کے درمیان تفرقہ ڈالنے آئے ہیں۔ انھوں نے جوش سے تمتماتے ہوئے چہرے سے جواب دیا کہ تم غلط سمجھے ہو۔ اس وقت اسلامیانِ ہند کا صرف اور صرف ایک بلا اختلاف لیڈر محمد علی جناح ہے۔ جس کی قیادت میں میں یک ادنیٰ سپاہی کی طرح اطاعت کرنا باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ ①

چنانچہ اقبال کی وجدانی بصیرت اور جنید بغدادی اور بایزید بسطامی جیسی فقر و بے نیازی نے کانگرسی لیڈر کی چال کو ناکام بنا دیا۔ ایسی بے لوث، بے نیاز، سیر چشم، ایثار پیشہ قربانی کی مثال کہاں ملتی ہے؟ جس پر اولیاء صفت انسان بھی فخر کر سکتے ہیں۔ کاش ایسے دو رہنما ملک کو یک بار پھر نصیب ہو جائیں۔

گفتگو کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک آ جاتا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے اور بعض دفعہ یہ حالت ہو جاتی کہ آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آتا۔ انھیں قرآن مجید کے مطالب پر حیرت ناک حد تک عبور تھا۔ ہر صحیح العقیدہ مسلمان کی طرح انھیں بھی یہ یقین تھا کہ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جسے حل کرنے میں قرآن رہنمائی نہ کرتا ہو۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے بعض آیات کو سمجھنے کے لیے مہینوں غور کیا ہے ان کے خیال میں قرآن تاریخ کا سب سے زیادہ مظلوم ہے کیونکہ اس کا ترجمہ اور تفسیر ایسے لوگ کرتے ہیں جو اچھی طرح عربی بھی نہیں جانتے۔ ان کا اپنا

---

① جاوید اقبال، زندہ رود (اقبال، نہرو، میاں افتخار الدین گفتگو)، ص ۳۸۶۔

ارادہ تھا کہ زمانے کے حالات اور قرآن کی روح کے مطابق قرآن کی شرح وتفسیر لکھیں گے مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ ①

حکیم احمد شجاع جو ایک نامور ڈرامہ نویس اور افسانہ نگار تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اقبال کے پاس حاضر ہوا تو انھیں بے حد مغموم دیکھا۔ وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ برس کی تھی۔ میں ابھی چند سال پیچھے ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر حضور ﷺ کی عمر سے میری عمر زیادہ ہوگئی تو یہ سوچ کر شرمسار ہوتا ہوں کہ یہ گستاخی میں شمار نہ ہو۔ ②

اسی ضمن میں انھیں وجدانی طور پر احساس ہو گیا تھا کہ ممکن ہے کہ زیادہ لمبی عمر نہ پائیں۔ ویسے بھی وہ جنوری ۱۹۳۴ء کے بعد مستقل بیمار رہنے لگے۔ حالات کے پیش نظر ۱۹۳۵ء میں انھوں نے اپنا وصیت نامہ لکھوا دیا۔ اپنے نابالغ بچوں جاوید اقبال اور منیرہ بانو کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کے لیے جو ولی مقرر کیے انھیں تاکید کرتے ہیں کہ بچوں کے لیے رشتے ناطے میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر ۵۸ برس تھی۔ جو کسی طرح بڑھاپے میں نہیں آتی۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے آئینہ ادراک میں بہت سے حالات پہلے سے منعکس کر دیتا تھا اور وہ تین سال بعد وفات پا گئے۔

اس ضمن میں یہ واقعہ دلچسپی کا حامل ہوگا کہ اقبال سے اپنی تاریخ وفات کا شعر خود ہی سرزد ہو گیا تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ حفیظ ہوشیار پوری جو ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے اقبال کی مثنوی مسافر پڑھتے ہوئے جب اس شعر پر پہنچے:

صدق و اخلاص و صفا باقی نہ ماند
آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

حفیظ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے انھیں خیال آیا کہ مصرعہ اول میں اعداد ۱۳۰۰ سے زائد معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیں کون سا سن ہجری نکلتا ہے۔ مصرعے کے اعداد و شمار کیے تو ۱۳۵۷ نکلا اور یہی اقبال کا سال وفات تھا۔ ③

---

① اقبال کی زیر تصنیف غیر مطبوعہ کتب، الحاج محمد حسین گوہر، یادگار اقبال، ص ۳۸۶-۳۹۸۔

② نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون حکیم احمد شجاع، ص ۶۷۔

③ روزگار فقیر، جلد دوم، ص ۲۶۲۔

اقبال کے ایک دوست ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی کہتے ہیں کہ قناعت، شکر اور ایثار علامہ کا شعار تھا۔ مال و دولت کے معاملہ وہ کبھی فکر مند نہیں ہوئے۔ ایک دفعہ میں نے عرض کی کہ جو آپ نے کتابیں تصنیف کیں ہیں ان کا اگر کسی پبلشر سے معاملہ کر لیا جائے تو حق تصنیف کی خاصی رقم مل سکتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں لندن کے کسی بڑے پبلشر سے بات کروں۔ علامہ نے خاص انداز میں "نہیں" کہا اور بولے مجھے بھی ایک دفعہ اس کا خیال آیا تھا پھر سوچا نہ جانے کتنے ضرورت مند اور مستحق لوگ میری تصنیف کے کاروبار سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاید اس میں یتیموں اور بیواؤں کا بھی حصہ ہو۔ اپنی ذات کے لیے ان سب کو فائدے سے محروم رکھنا مناسب نہیں۔ ① علامہ کے بھتیجے کی زبانی آپ اس کی تفصیل درج کر چکے ہیں۔ مجلسی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ علامہ کی نجی اور گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ جو ان کی طبع بے نیازی اور استغنا کا مظہر ہے۔

۱۹۰۰ء میں آپ گورنمنٹ کالج سے تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے تو بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر اندرون بھاٹی گیٹ ۱۹۰۵ء تک اور ۱۹۰۸ء تک تین سال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۲ء تک انار کلی اور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک میکلوڈ روڈ کرائے کے مکانوں میں مقیم رہے۔ اس کے بعد میو روڈ پر موجودہ اقبال روڈ پر اپنی کوٹھی تعمیر کر کے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء یوم وفات تک مقیم رہے۔ آپ جس مکان میں بھی رہے ان کی رہائش بالکل سادہ، صاف، بے تصنع اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے پاک رہی۔ ایک کرسی اپنے لیے اور کچھ مہمانوں کے لیے، سادہ سا بستر جب زیادہ دوستوں کا اجتماع اور قریبی دوستوں کی دعوت ہوتی تو بڑے کمرے میں قالین پر دسترخوان بچھ جاتا اور سب بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ گھر کی آرائش و سجاوٹ والے سامان کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی۔ گویا گھر سادگی اور بے نیازی کا نمونہ تھا۔ گرمی کے موسم میں بجلی کے پنکھے کے استعمال کا خیال کم ہی آتا۔ اگر چلاتے تو اس کا منہ دوسری طرف کر دیتے۔ کسی بڑے رئیس کے گھر کسی مقدمے کے لیے قیام کرنا پڑتا تو قیمتی اور نرم و گداز بستروں کی بجائے اپنا سادہ بستر کھول کر زمین پر سوتے۔ جو رسول مدنی ﷺ کی سنت پر عمل کی مثال تھی۔ ②

---

① ایضاً، ص ۸۰۔

② عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، ص ۲۳۱۔

لباس میں بھی کوئی خاص رکھ رکھاؤ اور دکھاوا نہ تھا۔ عدالتوں میں جاتے تو انگریزی سوٹ پہن لیتے نکٹائی کی بجائے کلپ سے بوٹائی لگاتے۔ مگر سوٹ میں نا آسودگی محسوس کرتے اور گھر آتے ہی علی بخش کو گھریلو لباس لانے کو کہتے۔ جو بتایا جا چکا ہے کہ گرمی میں دہری کنی دار دھوتی اور آدھے بازو کی بنیان اور سردی میں اس میں کمبل یا دھسّے کا اضافہ ہو جاتا یا کبھی شلوار قمیض پہن لیتے۔ اسی سادہ درویشانہ لباس میں وہ دنیاوی طور پر بڑے بڑے عہدیدار، رئیس، علماء اور ہر قسم کے معززین کو اپنی چارپائی پر بیٹھے ہوئے خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتے اور ہر طرح کے لوگ مل کر ایک جمہوریت پسند جماعت کا نمونہ پیش کرتے۔ حاضرین ان کی محبت دل میں لیے ان کے ارشادات سے فیض یاب ہوتے۔ ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کی مکمل آزادی تھی مگر علامہ کے تبحرِ علمی اور روانیِ گفتگو کے آگے کیفِ سماع سے محظوظ ہونا زیادہ پسند کرتے۔ یعنی اقبال اپنی مومنانہ فراست اور بے پایاں علم کی وجہ سے میرِ مجلس رہتے اور آنے والوں کے دلوں میں بستے اور شاہی کرتے جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے:

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی ①

علامہ سے ملنے والے مشاہیر کی فہرست کافی طویل ہے۔ لوگ نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ممالک سے بھی ملنے آتے اور تسکینِ طبع کا انمٹ تاثر لے کر جاتے۔ اقبال صرف ضرورت کے تحت لباس سلواتے۔ فیشن ایبل اور ڈیزائن دار لباس کا قطعاً شوق نہ تھا یہ کام علی بخش جو ایک ان پڑھ اور سادہ طبع ملازم تھا۔ اپنی پسند کا کپڑا بازار سے خرید کر درزی کو دے آتا جس کے پاس علامہ کا ناپ موجود ہوتا۔ جو کپڑے تیار کر کے گھر بھجوا دیتا۔ اقبال جیسا بھی لباس سلا ہوا اس کی تراش، سلائی پر کوئی تنقید کیے بغیر پہننا شروع کر دیتے۔ تقریبات کے لیے کبھی شیروانی یا چھوٹا کوٹ پہن لیتے۔ سر پر ترکی ٹوپی یا پشاوری پگڑی ہوتی۔ گویا لباس کے معاملے میں ان کی سادگی اور بے نیازی نے تکلفات اور جسمانی زیب و زینت کے اہتمام سے بے نیاز کر رکھا تھا۔

اسی طرح خوراک کے معاملے میں اپنی پسند ناپسند کا اظہار ان کی شانِ استغنا اور اطمینانِ قلب کے خلاف تھا اس بارے میں انھوں نے واشگاف کہا ہے:

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۲۷۔

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم! (۱)

ان کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ انھوں نے بتایا کہ جب پہلے پہل کرائے کے مکان میں رہائش اختیار کی اور علی بخش کو ملازم رکھا تو اس نے کسی سے آلو گوشت پکانا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ آلو گوشت پکا کر سامنے رکھ دیتا۔ کئی مہینے تک وہ دونوں وقت آلو گوشت کھلاتا رہا۔ اس کا یہ معمول بھولنے والی چیز نہیں۔ البتہ بعد میں دوسری چیزیں اچھی طرح پکانا سیکھ گیا۔ آخری سالوں میں علالت کی وجہ سے ان کی خوراک ویسے بھی کم ہوگئی۔ صبح حلوے کے ساتھ کلچہ اور چائے باقر خوانی کے ساتھ پیتے۔ اور دوپہر کو سبزی گوشت۔ دن کے وقت مجلس میں ہی علی بخش سینی میں کھانا رکھ کر لے آتا۔ علامہ حاضرین کو کھانے کی صلا دیتے پھر ایک دو چپاتیاں کھا کر علی بخش سے ہاتھ دھلوا کر فارغ ہو جاتے اور مجلس کی کاروائی پھر سے شروع ہو جاتی۔ اقبال کو آم مرزا غالب کی طرح بہت پسند تھے۔ اکبر الٰہ آبادی جنھیں اپنا دوست اور راہنما مانتے تھے۔ ان کے لیے لنگڑے آم کی پیٹی ارسال کرتے جس کے تشکر کے لیے اقبال نے اکبر کو یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا:

تیرے فیضِ مسیحائی کا یہ اعجاز ہے اکبرؔ!
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

علالت اور سخت شوگر کی وجہ سے ڈاکٹر اور حکماء نے آم کھانے سے پرہیز کی ہدایت کی تھی۔ مگر اقبال کے اصرار پر صرف ایک آم کھانے کی اجازت مل گئی۔ دوسرے دن حکیم قرشی نے دیکھا کہ کوئی سیر بھر کا آم میز پر رکھا ہے۔ حکیم صاحب نے اعتراض کیا تو کہا ایک ہی تو ہے جس کی اجازت آپ دے چکے ہیں۔ حکیم صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ سوغات کے طور پر احباب آم بھیجتے تو اقبال علی بخش کو کہتے کہ اس میں سب سے اچھا آم نکالو۔ وہ نکال کر دیتا تو کہتے کہ اسے تم کھالو۔ اسے بھی ایک طرح سے استغنا اور سیر چشمی کہنا چاہیے۔ باہر سے خط لکھتے تو گھر کے افراد کے ساتھ علی بخش کو بھی سلام لکھتے۔ (۲)

---

(۱) ایضاً، ص ۳۲۵۔

(۲) روز گارِ فقیر، جلد دوم، ص ۱۷۶۔

مرض الموت میں غذا، ادویات کے بارے میں حسِ ذائقہ تیز ہو گئی تھی۔ انگریزی ایلوپیتھی کی خشکی اور کڑوی بو سے بیزاری کا اظہار اور کھانے میں تامل کرتے۔ مشرقی طبی ادویات سے خمیرہ مروارید، خمیرہ گاؤزبان، مفرح معجون و مرکبات کے شیریں ذائقے اور خوشبو کی تعریف کرتے اور کہتے کہ ان کے ذائقے سے آدھا مرض کم ہو جاتا اور شوق سے کھا لیتے۔ حقہ کا ساتھ بھی ساری عمر رہا۔

علی بخش ہر وقت خیال رکھتا کہ چلم ٹھنڈی نہ ہو۔ اور تازہ بھر کر نئی لے آتا۔ غالباً غالب کے پیمانہ وصہبا کے اثر سے جو اُن پر غیب سے مضامین آتے حقے کے اثر سے اقبال پر آمد آتی ہو۔ تاہم یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انھوں نے کبھی مے نوشی کی ہو۔ علی بخش چالیس سال تک ان کے ساتھ رہا۔ اس کے سامنے کبھی گھر میں شراب کا گزر نہیں ہوا۔ یورپ میں تین سال کے قیام کے دوران میں جہاں دن رات مصروف گزارے عطیہ فیضی نے ان کے شب و روز کے اشغال کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کبھی شراب کا ذکر نہیں کیا۔ ذرا غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کا انسانی دردمندی و سوز سے معمور درویشی اور فقیر مجسم کا کردار شراب نوشی کے غیر اخلاقی اثرات کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اقبال تو حافظ شیرازی کی شرابِ معرفت کے بھی سخت خلاف تھے۔ پھر اُمّ الخبائث کے گمراہ کن اثرات کو کیوں کر قبول کر سکتے تھے۔

اصل میں بہت سی بے سروپا باتیں حاسدین کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ جن کا تجربہ اقبال کو ۱۹۲۶ء کے اسمبلی الیکشن میں بخوبی ہو گیا تھا۔ مگر علالت کی وجہ یہ تھی کہ کونسل کی ممبری کو عوام کی نمائندگی کے لیے ہمہ وقت ذمہ داری سمجھ کر دن رات کام کیا۔ وکالت ختم ہو گئی۔ کثرتِ کار اور محدود آمدنی نے صحت تباہ کر دی۔ جن کتابوں کے لکھنے کا ارادہ تھا۔ ان حالات میں پورا نہ ہو سکا۔ غرض یہ کہ اسمبلی کی ممبری کے فریضے سے تو سرخرو ہو گئے مگر صحت اس قدر لاعلاج ہو گئی کہ شہید قوم ہو گئے۔ قوم کے لیے یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ اور حکیم قرشی ہر روز ان کے علاج کے لیے حاضری دیتے۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بلکہ امراض کی فوج نے ہر طرف سے یلغار کر دی۔

اتنی شدید تکلیف کو برداشت کرنا ان کا ہی حوصلہ تھا نظر آنا بھی بند ہو گیا۔ مگر احباب کی قربت میں وہ حالاتِ حاضرہ پر بات چیت شروع کر دیتے۔ ان حالات میں وہ قومی معاملات

پر اظہارِ خیال فرماتے۔ ان کا ذہن آخری دم تک زیرک و حاضر رہا۔ ① وفات سے کچھ دن پہلے انھوں نے قائداعظم کو یونینسٹ پارٹی سے معاہدہ ختم کرنے کے لیے طویل خط لکھوایا۔ وفات کی رات ان کو درد سے تڑپتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن تجویز کیا۔ جسے اقبال نے سختی سے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ:

I want to face death while in my senses.

(میں موت کا ہوش میں سامنا کرنا چاہتا ہوں)۔ ②

یہ ایک بہادر، مطمئن بے نیاز شخص کا نعرۂ مستانہ تھا۔ جو موت کے ڈر سے بے خوف تھا۔ آخری سانس صبح کے پانچ بجے کے قریب لی۔ دائیں رخ ہو گئے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر اللہ اکبر کہا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ حاضر دوستوں نے دیکھا کہ موت کے بعد ان کے چہرے پر سکون اور لبوں پر مسکراہٹ ہے اور وہ اپنے شعر کی تصویر نظر آئے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست ③

اقبال ایک مختصر وقفۂ زندگی میں عمل سے بھرپور زندگی گزار کر جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ جس کے روشن اور کہیں بہتر ہونے کا انھیں بھرپور یقین تھا۔ ان کے فلسفۂ خودی کی بنیادی بات یہ ہے کہ دنیا میں ہم اپنی خودی کی تکمیل کے لیے آتے ہیں۔ اس زندگی کو جس حد تک کوئی اپنی خودی کی تکمیل کرے گا اس کے مطابق آئندہ زندگی کا ایجنڈا قادرِ مطلق نے اس کے لیے تیار کیا ہوگا۔ لہٰذا اقبال کی زندگی اور موت اہلِ دنیا خصوصاً مسلمانوں کے لیے ایک ایسا درخشاں پیغام ہے جس پر ہماری پُر یقین پیروی ہماری انفرادی اور ملی عظمت اور وقار کو بحال کر سکتی ہے۔ اور ہمارا ملک اقوامِ عالم میں سرخرو ہو سکتا ہے۔ اقبال کے اس الہامی شعر پر اپنی معروضات ختم کرتا ہوں:

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا ④

---

① عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۲۰۹۔
② نقوش اقبال نمبر ۲، مضمون م۔ش، ص ۳۵۷۔
③ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۱۰۳۷۔
④ کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۱۶۔

حضرت مجدد الف ثانی، محی الدین ابن عربی اور علامہ اقبال — ایک اجمالی جائزہ

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی ایک انتہائی معزز، صوفی اور عالمانہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد عبدالاحد خود پیرِ طریقت تھے جو روحانی و علمی فیوض کی تحصیل کے لیے قطبِ عالم حضرت شیخ عبدالقدوس کے زیرِ تربیت رہے۔ انھوں نے حضرت عبدالاحد کو بتایا کہ آپ کی پیشانی میں ایک ولیِ کامل کا نور جلوہ گر ہے۔ عبدالقدوس وفات پا گئے تو انھوں نے راہِ سلوک کی منازل اُن کے فرزند حضرت رکن الدین کے ذریعے طے کیں اور انھیں خرقۂ خلافت قادریہ چشتیہ عطا ہوا۔ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سے انھیں بہت محبت تھی اور یہی نصیحت انھوں نے اپنے فرزندِ ارجمند حضرت مجدد الف ثانی کو اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے بارے میں کی۔ والد ماجد کو حضرت شاہ کمال کیتھلی نے بشارت دی تھی کہ آپ کے ہاں فرزند پیدا ہوگا جو افضل اولیاء امت ہوگا اور اس کے نورِ ہدایت سے شرک و بدعت کی تاریکی دور ہوگی اور دینِ اسلام کی روشنی کو فروغ حاصل ہوگا۔

حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی کی ولادت باسعادت ۹۷۱ھ کو ہوئی۔ پیدائش کے وقت ہی آپ کی ولایت کے آثار ہویدا تھے۔ آپ عام بچوں کی طرح کبھی نہیں روئے بلکہ مسکراتے رہتے تھے، نہ ناپاک ہوتے۔ حضرت شاہ کمال کیتھلی کی دعا سے سلسلۂ قادریہ کے تمام اوصاف و انعامات ان کی ذات والاصفات تک پہنچ گئے۔ آپ نے قلیل مدت میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ تحصیلِ علم کے لیے آپ نے پہلے والدِ بزرگوار اور پھر سیالکوٹ میں ملا کمال کشمیری جو دینی علوم میں ایک متبحر عالم تھے، سے مستفید و مستفیض ہوئے۔ حضرت مجدد کے ہم درسوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جو بعد میں سیالکوٹ دانش گاہ کے مہتمم اعلیٰ مقرر ہوئے ایک

یگانۂ روزگار عالم تھے اور حضرت مجدد کے ہاتھوں پر بیعت تھے، انھوں ہی نے حضرت مجدد کی ذاتِ والا صفات کے مطابق "مجدد الف ثانی" کا خطاب دیا، جو اصل نام پر سبقت لے گیا۔ دوسرے ہمدرس نواب سعد اللہ خان وزیرِ اعظم شاہجہان تھے۔ اوّلین تعلیم کے بعد جب حضرت مجدد الف ثانی، حضرت خواجہ باقی اللہ کے ہاں زیرِ تربیت رہے اور خلعتِ خلافت سے سرفراز ہوئے تو سرہند میں مقیم ہو کر تربیتِ طالبین و ہدایتِ سالکین میں مصروف ہو گئے۔

حضرت مجدد الف ثانی کے کمال کے اعتراف کے طور پر حضرت باقی باللہ اپنے دوسرے مریدوں کے ساتھ آپ کے حلقۂ ارادت میں بیٹھتے تو نہایت تعظیم و ادب ملحوظِ خاطر رکھتے، آپ کی طرف پشت نہ کرتے۔

حضرت غوثِ اعظم نے اپنا خرقہ اپنے جانشین سید تاج الدین کو اس وصیت کے ساتھ تفویض کیا کہ جب حضرت مجدد الف ثانی کا ظہور ہو تو انھیں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ یہ خرقہ امانت کے طور پر اگلی نسل تک پہنچتا رہا اور بالآخر حضرت مجدد کے ظہور پر آپ کے ہم عصر شاہ سکندر خرقہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ساتھ ہی خاندانِ عالیہ قادریہ کی خلافت بھی آپ کو پہنچائی۔

۱۰۲۳ ہجری شب برات کو آپ نے اپنے خلفاء اور مریدین سے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ برس تھی، میری بھی اس سال ۶۳ برس ہو جائے گی اور میں خالقِ حقیقی سے جا ملوں گا۔ آپ نے حاضرین کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی مکمل اتباع کرتے رہنے کی تلقین کی اور اس کے بعد یہ آفتابِ ہدایت ۱۰۲۳ ہجری کو غروب ہو گیا۔ ⓵

جب آپ نے سرہند میں عملی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت شہنشاہ اکبر کی نام نہاد اسلامی حکومت کے باوجود ہندو اکثریت نہ صرف تجارت، سیاست، معیشت اور انتظامی شعبوں پر مسلط تھی بلکہ انھوں نے اپنے مذہبی عقائد کو بھی برتری دے رکھی تھی اور اسلام کی روح اوہام، بے عملی اور مذہب سے بے اعتنائی کے پردوں تلے چھپ چکی تھی۔ خود شہنشاہ اکبر آفتاب کی پرستش کرتا تھا، ہندوانہ لباس پہنتا، ماتھے پر قشقہ لگاتا اور زنار پہنتا تھا۔ صبح جھروکے میں بیٹھ کر رعایا کو درشن دیتا اور سجدہ کراتا، جو عبادت سمجھی جاتی۔ شادی بھی ہندو رانی جودھا بائی سے کی تھی، گائے کے

⓵ عنایت عارف، کشف المعارف، الفیصل ناشران کتب، اردو بازار، لاہور، ص ۱۳۔

ذبیحہ کی سخت سزا تھی اور شراب اور جوا عام تھے۔ غرضیکہ حکومت ہندوؤں کی مکمل سرپرستی کرتی تھی اور اکبر کے دین الٰہی کے ملحدانہ حرکات سے اسلام کو مذہبی اور سیاسی طور پر زوال کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ توحید و رسالت سے بیگانگی ظاہر ہوتی تھی اور قرآن حکیم، سنت و حدیث کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ علماء سو کی بڑی تعداد حکومت کی ہمنوائی اور خوشنودی کے لیے مسلمانوں کو مذہب سے دور لے جا رہی تھی۔ ہندو اکثریت آئے دن مسلمانوں پر ظلم ڈھاتی، مساجد کو مندروں میں تبدیل کرتی اور مسلمانوں عورتوں کو اٹھا لیا جاتا۔

ایسے تاریک اور حوصلہ شکن حالات میں حضرت مجدد نے کتاب و سنت کی برتری قائم کرنے اور احیائے اسلام کے لیے زبردست جدوجہد کا آغاز کیا۔ اپنے خلفاء و مریدین با صفا سے رابطے کیے جو سلطنت کے ہر حصے میں موجود تھے۔ حضرت مجدد اپنے کفر شکن، ایمان افروز مکتوبات جو معارف و حقائق اور رموز و اسرار الٰہی کا ایسا بے نظیر گنج گرانمایہ ہیں اور ان میں دین متین کے بارے میں ایسے جواہر پارے اور موتی بکھرے ہوئے ہیں، جس کی مثال نہیں ملتی اور ان معارف و حقائق نے جس طرح باطل قوتوں کو شکست دی تو زمانے کے بڑے بڑے علماء راسخین و مشائخ کرام نے تصدیق کی کہ آپ نے "مجدد الف ثانی" کے منصب کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ ان حقائق سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ امام ربانی کے وقت دو قوموں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اختلافات ہو چکے تھے جو بعد میں "دو قومی نظریہ" کے تحت تحریک پاکستان کا سبب بنے۔ ①

حضرت مجدد الف ثانی کے کچھ ایمان افروز ارشادات نقل کیے جاتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کی محبت مجھ پر اس طرح غالب ہے کہ میں حق تعالیٰ کو صرف اس واسطے پیار کرتا ہوں کہ وہ محمد ﷺ کا رب ہے۔

محبت ذاتی فنا کی علامت ہے اور فنا سے مراد ماسوائے اللہ کا فراموش ہو جانا ہے۔

انسان خدا تعالیٰ کا بندہ اس وقت ہوتا ہے جب ماسوائے اللہ کی گرفتاری اور بندگی سے پورے طور پر خلاصی پا لے۔

---

① پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، مجدد الف ثانی اور ڈاکٹر محمد اقبال، ضیاء الاسلام پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۰۔

علماء کے لیے دنیا کی محبت اور رغبت ان کے پر جمال چہرے کا بدنما داغ ہے۔
شریعت، دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کی ضامن ہے۔ طریقت در حقیقت شریعت کی خادم ہے۔
مرت ایک پل ہے جو ایک دوست کو دوسرے سے ملاتا ہے۔
شریعت اور حقیقت ایک دوسرے کا عین ہیں۔
شیطان خدا کے کرم پر مغرور کر کے سستی میں ڈالتا اور اس کی عفو کا بہانہ بنا کر گناہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔
گناہ صغیرہ پر اصرار کرنا کبیرہ تک پہنچا دیتا ہے اور کبیرہ پر اصرار کرنا کفر تک لے جاتا ہے۔
اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا اور خلقِ خدا پر شفقت کرنا آخرت کی نجات کے دو بڑے رکن ہیں۔
انسان جب تک مرضِ قلبی میں مبتلا رہتا ہے کوئی عبادت واطاعت اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔
جس نے اپنی آنکھ پر قابو نہ پایا دل بھی اس کے قابو میں نہیں۔
یہ کس قدر بڑی نعمت ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندے کو جوانی میں توبہ کی توفیق عطا کرے اور اس پر استقامت بخشے۔
منازلِ سلوک طے کرنا کا مقصود ایمانِ حقیقی کا حاصل ہونا جو نفس مطمئن ہونے سے وابستہ ہے۔
علماء سُو دین کے چور ہیں، ان کا مقصود ہمہ تن یہ ہے کہ خلقِ خدا کے نزدیک مرتبہ و ریاست و بزرگی حاصل ہو جائے۔
عاقبت کی بہتری ذکرِ کثیر سے وابستہ ہے۔
واسطے اور وسیلے جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر راستہ زیادہ نزدیک اور روشن ہوگا۔
اولیائے کامل اور انبیائے مرسل کی ہدایت حقیقت ہے اور دونوں کی نہایت شریعت ہے۔
نوافل کا ادا کرنا ظلی قرب بخشتا ہے اور فرائض کا ادا کرنا قربِ اصلی۔
نمازی جو نماز کی حقیقت سے آگاہ ہے نماز ادا کرتے وقت عالم دنیا سے نکل کر عالمِ آخرت میں داخل ہو جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول نہیں کرتا نہ ہی کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے۔ حق تعالیٰ کسی

چیز سے متحد نہیں۔
"انا الحق" کے معنی یہ نہیں کہ میں حق ہوں بلکہ یہ کہ میں نہیں ہوں حق موجود ہے۔
نبوت کی حقیقت عقل کی حقیقت سے بالاتر ہے۔
کوئی ولی کسی نبی کے درجہ تک نہیں پہنچتا بلکہ ولی کا سر ہمیشہ نبی کے قدموں کے نیچے ہوتا ہے۔
جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو اس سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔
عمل کی سستی اور غفلت پر مغفرت کی امید ہے لیکن اعتقادی سستی میں مغفرت کی گنجائش نہیں۔
تسبیح و تہلیل کا ثواب ماں باپ بھائیوں استادوں کو بخشنا بہتر ہے، اس میں اپنا بھی نفع ہے۔ عجب نہیں کہ دوسرے کے طفیل قبول کر لیں۔
خلافت کی دولت انسان کے علاوہ کسی کو میسر نہیں۔
ولایت کا اظہار واجب نہیں بلکہ اس کا چھپانا اور پوشیدہ رکھنا بہتر ہے۔
دنیا میں جس قدر محنت ہے، آخرت میں اس سے کئی گنا مسرت ہے۔ (1)

حضرت مجدد الف ثانی کا ہندوستان کے بزرگانِ دین اور مفکرین اسلام میں نہایت بلند مقام ہے۔ آپ نے اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تجدید دین کا فریضہ سرانجام دیا اور ان جلیل القدر شہنشاہوں کے رعب و جلال کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اسی وجہ سے آپ کو "مجدد" کا لقب دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدد ہوتا ہے جو دین کو آلودگیوں سے پاک کرتا اور صحیح دین کی روشنی پھیلاتا ہے۔ مگر ایک مجدد ایک ہزار سال کے بعد آتا ہے جس کا مرتبہ صدی والے مجدد سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کو "مجدد الف ثانی" کہا جاتا ہے کہ آپ ہجری سن کے دوسرے ہزار سال کے مجدد تھے۔ (2)

حضرت مجدد الف ثانی نے جب تبلیغ دین کا کام شروع کیا تو اکبر کے ملحدانہ دین الٰہی کا بڑا

---

(1) عنایت عارف، کشف المعارف، الفیصل ناشران کتب، اردو بازار، لاہور، ص 52۔
(2) مکتوبات اقبال، مرتبہ سید نذیر نیازی، ص 193۔

شہرہ تھا۔ آپ نے دینِ الٰہی کے خلاف نہایت موثر پرچار شروع کیا۔ جب جہانگیر بادشاہ بنا تو آپ کو دربار میں بلایا۔ حضرت نے درباری قواعد کے مطابق سجدہ تعظیمی نہ کیا۔ جس پر جہانگیر نے برافروختہ ہو کر آپ کو سزا کے طور پر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ ① جہانگیر کے بہت سے امراء، وزراء اور جرنیل حضرت کی بیعت میں آچکے تھے، آپ کے قید کیے جانے پر انھوں نے بغاوت کر دی۔ جن میں ایک جرنیل مہابت خان بھی تھا۔ جہانگیر، مہابت خان کی بغاوت کو دبانے کے لیے روانہ ہوا مگر اس نے جہانگیر، آصف خان اور نور جہاں کو قیدی بنا لیا۔ اس پر حضرت مجدد نے اپنے مرید جرنیلوں اور امراء کو لکھا کہ:

> مجھے سلطنت کی ہوس نہیں، نہ میں تمھارے فتنہ وفساد کو پسند کرتا ہوں۔ میں نے قید و بند کی تکلیف اٹھائی تو وہ اور کام کے لیے ہے، وہ پورا ہو جائے گا تو میں خود بخود تمھاری کوشش کے بغیر ہی قید سے رہا ہو جاؤں گا۔ یہ فساد میرے کام کے لیے رکاوٹ ہے۔ بہتر ہے کہ تم بغاوت سے باز آجاؤ اور فوراً اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لو، میں بھی ان شاء اللہ قید سے جلد آزاد ہو جاؤں گا۔ ②

مہابت خان نے یہ ہدایت ملنے پر بادشاہ کو رہا کر دیا اور آدابِ شاہی بجا لایا۔ اس کے بعد جہانگیر آپ کا معتقد ہو گیا اور آپ کی خواہش کے مطابق امورِ شرعیہ رائج کرنے کے لیے اقدام کیے۔ جہانگیر کے بعد شاہجہان بھی آپ کا بے حد احترام کرتا تھا اور آپ کی بیعت کی۔

علامہ اقبال کو حضرت مجدد کی یہ دلیری پسند آئی کہ کس طرح جبر و طاقت کے آگے حضرت مجدد الف ثانی نے خودی کی حفاظت کا سبق دیا۔ انھوں نے اپنی نظم "پنجاب کے پیرزادوں سے" میں آپ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

---

① انوارِ اصفیاء، شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۳۶۵۔
② ایضاً، ص ۳۶۵۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار ①

علامہ اقبال نے شیخ الاکبر ابن عربی کے "فلسفہ وحدت الوجود" کی مخالفت کی تھی۔ جس کی بنیاد یہ تھی کہ فلسفہ مسلمانوں میں بے عملی کو جنم دیتا ہے۔ حضرت مجدد بھی ابن عربی کے "فلسفہ وحدت الوجود" کو دینی تعلیمات کے خلاف تصور کرتے تھے۔ اقبال کے زمانہ کے سیاسی وسماجی حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ عمل اور جدوجہد کی تلقین کریں۔ انھوں نے وجودی فلسفے کو اس کے خلاف سمجھا تو اس کی مخالفت پر کربستہ ہو گئے۔

امام ربانی کے زمانے میں وجودی فلسفے کے پیروکار زیادہ تر اس کے ملحدانہ پہلو کو ابھار رہے تھے۔ اکبر نے دین الٰہی کا تصور پیش کیا تھا۔ وہ دربار میں حاضر ہونے والوں سے سجدہ کراتا تھا۔ ② وجودی فلسفہ کے تحت یہ عمل اس طرح جائز تھا کہ جب ہر شے میں خدا ہے تو سجدہ غیر خدا کے سامنے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امام ربانی کو اس قسم کے حالات ومشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ لوگ وجودی فلسفہ اور صوفیاء خام کی دینی اعمال میں غفلت کے تحت شریعت کی پابندیوں سے خود کو آزاد کرنے کے مرتکب ہو رہے تھے۔ شریعت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی اور دین کا مقصود شریعت کے علاوہ کچھ اور خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابن عربی کے فلسفہ کو اس بے راہ روی کا ذمہ دار قرار دیا۔ ③ انھوں نے اس ضمن میں اپنا نظریہ پیش کیا جسے "وحدت الشہود" کہا جاتا ہے۔ وہ "وحدت الوجود" سے "وحدت الشہود" تک کے سفر میں عرصۂ دراز کے غور وفکر ذہنی وقلبی کشمکش میں مبتلا رہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے فضل سے کشف کے ذریعے حقیقت منکشف ہو گئی۔ اگرچہ انھوں نے وجودی مسلک کو بالکل غلط قرار نہیں دیا، اسے صرف راستے کی ایک عارضی منزل سمجھا اور کہا کہ وحدت الوجود کی انتہا "سکر" یعنی جذب و فنا پر ہوتی ہے جب کہ وحدت الشہود کی انتہا "صحو" یعنی ہوش مندی اور بقا پر ہوتی ہے۔ صحو یقیناً

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۵۱۔
② تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ نذیر نیازی سید، ص ۲۹۸۔
③ مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، حصہ دوم، ترجمہ مولانا محمد سعید، ص ۱۶۹۔

شکر سے بہتر ہے کیونکہ وہ شریعت اور عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ (۱) علاوہ ازیں انھوں نے ابن عربی کے برخلاف نبوت کو ولایت پر ترجیح دی کیونکہ نبی صاحب شریعت ہوتا ہے جب کہ ولی اس سے محروم ہوتا ہے۔ (۲)

حضرت امام ربانی نے حسین بن منصور حلاج کے قول "انا الحق" کا مفہوم شکر کے لحاظ سے کیا ہے کہ غلبۂ حال میں ماسوا حق تعالیٰ کے ہر شے ان کی نظر سے پوشیدہ تھی۔ انھوں نے حق سبحانہ کے سوا کسی شے کو ثابت اور موجود نہ جانا تو "انا الحق" کے الفاظ ان سے صادر ہو گئے۔ حالانکہ اس وقت ان کی اپنی ذات موجود تھی۔ (۳)

مگر اقبال نے اس کی تشریح صحو کے لحاظ سے کی ہے اور کا یہ مطلب لیا ہے کہ منصور حلاج کہہ رہا تھا کہ میرا وجود حق ہے یعنی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق کہ جب انسان نے اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کر کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی طرف قدم بڑھایا تو اس تقرب و ایصال کی ترجمانی "انا الحق" یا "انا الدھر" جیسے اقوال میں ہوئی۔ لہٰذا اسلامی تصوف کے اعلیٰ مراتب میں اتحاد و قرب الٰہی سے یہ مقصود نہیں تھا کہ انسان کی متناہی خودی خدا تعالیٰ کی لامتناہی خودی میں جذب ہو کر اپنی ہستی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ لامتناہی خودی کی تجلیاتی صفات کو اپنی ذات میں سمو لے۔ (۴)

مگر حضرت مجدد اس سے متفق نہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات واحد، بے مثال و یکتا ہے اور انسان کے اندر سمانے یا حلول کرنے کے امکانات سے باہر ہے۔ نہ ہی انسان اس کی صفات کو حاصل کر سکتا ہے۔ انسان جب انتہائی کمال حاصل کر لے تو بھی اس

---

(۱) ایضاً، دفتر اول، حصہ دوم، ترجمہ محمد سعید، ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، ص ۱۱۰۔
(۲) ایضاً، ص ۱۱۱۔
(۳) ایضاً، ص ۱۱۳۔
(۴) ایضاً، ص ۱۶۷۔

مقام پر اپنے مولیٰ کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں پاتا اور اس کا محتاج رہتا ہے۔ مگر حضرت اقبال کہتے ہیں کہ انسان راہِ سلوک میں ترقی کے انتہائی مراحل طے کر لیتا ہے تو اپنے اندر خدائی صفات پیدا کر لیتا ہے یعنی:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفرین کار کشا کار ساز ①

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟ ②

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

البتہ مقام بندگی کے حسول میں علامہ محمد اقبال اور حضرت مجدد کے نظریات میں اتفاق ہے اور دونوں بندہ ہونے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ پیدائشِ انسانی سے مقصود بندہ ہونے کا حق ادا کرنا ہے۔ اگر بندے کو راہِ حیات میں عشق و محبت عطا کر دیا گیا ہے تو اس کا مقصود یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے ماسوا سے ہر طرح کا تعلق قطع کر لے تا کہ مقام عبدیت حاصل کر سکے۔ مراتب ولایت کی انتہا مقامِ عبدیت ہے۔ ولایت کے درجات میں مقام عبدیت سے اوپر کوئی مقام نہیں۔

علامہ محمد اقبال نے بھی عشق و محبت کو انسانی خودی کے بلند کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جو مقامِ عبدیت پر پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ مقامِ عبدیت نہایت بلند مقام ہے۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۸۹۔
② ایضاً، ص ۳۴۷۔

حضرت مجدد کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے مقام عبدیت کو پالیا تھا اور وہ عام انسانوں کی طرح نہ تھے بلکہ وہ عبدیت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے کے علاوہ اس سے بھی آگے نبوت کی روشنی سے منور تھے۔ علامہ محمد اقبال نے منصور حلاج کی زبانی "عبد" اور "عبدہٗ" کی تشریح میں بے مثال نظم لکھی ہے۔ جس میں سے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ
ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بُواست
کس ز سرّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرّ الا اللہ نیست ①

اس نظم میں "عبد" عام انسان اور "عبدہٗ" سے رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس مراد ہے۔ نظم میں انتہائی عقیدت ومحبت میں حضور ﷺ کی شان میں ماورائیت کا تاثر ملتا ہے، جس کا جھکاؤ ابن عربی کی جانب محسوس ہوتا ہے۔ یہاں حضرت مجدد اور ابن عربی کے نظریات میں فرق معلوم کرنے کے لیے "وحدت الوجود" اور "وحدت الشہود" کی اصطلاحوں کا مطلب واضح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مجدد کے نزدیک توحید دو طرح کی ہے:

(۱) توحید شہودی (۲) توحید وجودی

توحیدِ شہودی ایک ذات کو دیکھنا ہے یعنی سالک کا مشہود یا مرکزِ نظر صرف ایک ہی ذات ہو۔ توحیدِ وجودی اس ذات کو موجود جاننا ہے اور اس کے غیر کو معدوم خیال کرنے کے باوجود مظاہر کائنات کو ایک جاننا ہے۔

پس توحیدِ وجودی بمنزلہ "علم الیقین" ہے اور توحید شہودی "عین الیقین" ہے۔ اس مسئلہ کو انھوں نے اس طرح مثال سے واضح کیا ہے۔ ② کہ ایک شخص کو وجودِ آفتاب کا یقین ہو اور اس یقین کے ساتھ وہ ستاروں کو معدوم نہ جانے کیونکہ آفتاب کے آگے اگرچہ ستارے نظر نہیں

① کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۱۷۔
② مکتوبات امام ربانی، ترجمہ سعید احمد، ص ۲۶۸۔

آئیں گے لیکن اُسے یہ یقین ہے کہ ستارے موجود ہیں مگر نورِ آفتاب کے آگے مغلوب ہیں۔ چنانچہ یہ شخص اس جماعت یا فرد کو درست نہیں جانتا جو ستاروں کی نفی کر رہی ہے۔ یعنی وحید وجودی جو ایک ذات تعالیٰ کے ماسوا نفی پر مبنی ہے، عقل و شرع کے خلاف ہے۔ توحید شہودی کے مطابق ستاروں کو نہ دیکھ سکنا خلاف عقل نہیں کیونکہ یہ غلبۂ آفتاب کے حوالے سے ضعیف بصارت کی بناء پر ہے۔ لیکن اگر دیکھنے والے کی آنکھ تجلیاتِ الٰہی و نورِ ایمانی سے روشن ہو تو وہ عین آفتاب کے آگے بھی ستاروں کو دیکھے گی اور یہ "حق الیقین" کا مرتبہ ہے۔ ①

علامہ محمد اقبال، حضرت مجدد کے اس نظریئے سے اتفاق کرتے ہیں کہ انسان کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ آفتاب کے سامنے اپنے وجود کو قائم رکھ سکے اور اپنے اندر آفتاب کے نور کو اس طرح پیدا کرلے کہ اسے بظاہر معدوم ستاروں کا وجود نظر آنے لگے۔ علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان خود کو ختم نہ کرے، نہ کسی کی ذات میں جذب ہو خواہ وہ کتنی ہی برتر ہی کیوں نہ ہو۔ بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ خدا سمندر ہے اور انسان قطرہ اور وہ سمندر یعنی خدا میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کر کے سمندر بن جاتا ہے۔ بقول غالب:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مگر یہ بات علامہ اقبال کو منظور نہیں وہ اپنے چھٹے خطبے میں حضرت مجدد کی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ انھوں نے "انا الحق" کی بجائے "انا الموجود" کہا تھا۔ ② گویا انھوں نے عبدیت کی حقیقت کو سمجھا اور اعلیٰ عبدیت ہی پر اپنے فلسفۂ خودی کی بنیاد رکھی۔ عبدیت کے بارے میں

---

① ایضاً، ص ۱۶۷۔

② تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ سید نذیر نیازی، ص ۳۱۵۔

وہ فرماتے ہیں:

اک تُو ہے حق اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی ①

علامہ محمد اقبال نے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح حضور ﷺ اللہ کے سامنے اپنے وجود اور خودی کو برقرار رکھ سکے ایسے ہی ہمیں رکھنا چاہیے۔ خودی کا نصب العین صرف یہ نہیں کہ وہ کچھ دیکھ سکے بلکہ یہ کہ کچھ بن کر دکھائے اور اسی مقصد کے لیے کوشش اسے موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں "انا الموجود" کہہ سکے اور اپنی اصلیت اور اساس کو پالے۔

حضرت مجدد نے اپنے بیان میں توحید وجودی کو "سکر" اور توحید شہودی کو "صحو" کہا ہے۔ [مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، حصہ دوم، ترجمہ محمد سید احمد، ص ۲۶۹، ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی] دراصل ابن عربی نے جس مقام کو ولایت کہا ہے، حضرت مجدد نے اسے صرف عارضی منزل قرار دیا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک ولایت، نبوت سے افضل ہے۔ کیونکہ ولایت کا رخ خدا کی طرف ہے اور نبوت کا مخلوق کی طرف وہ نبی کو بھی اس لیے سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں کہ وہ ولایت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتا ہے۔ ② مگر حضرت مجدد الف ثانی نبوت کو ولایت سے اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولایت سکر یعنی حالتِ جذب ومحویت ہے اور وہ صرف اپنی ذات تک محدود ہوتی ہے۔ حضرت مجدد کے مطابق نبوت کا رخ فیضانِ ہدایت کے لیے صرف مخلوق کی طرف نہیں بلکہ مخلوق کی طرف توجہ کے باوجود حق تعالیٰ کی طرف توجہ موجود رہتی ہے، اس کا باطن خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر مخلوق کے ساتھ۔ یہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام موجودات سے افضل ہیں خواہ وہ نبی کی ولایت ہو یا ولی کی ولایت۔ تو ثابت ہوا کہ صحو، سکر سے افضل ہے۔ علوم شرعیہ کا منبع مرتبۂ نبوت ہے جو سراسر صحو یا افاقہ ہے۔ پس تقلید کے لائق اہل صحو ہیں، اہل سکر نہیں۔ ③

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ۳۳۶۔

② مکتوباتِ امام ربانی، ترجمہ سعید احمد، ۲۶۹۔

③ فصوص الحکم، ترجمہ حافظ برکت اللہ، اقبال پبلشرز، کراچی، ۱۸۰۔

صاحبانِ سکر کائنات اور اس میں تمام موجودات کو "ہمہ اوست" مانتے ہیں ؛ مگر حضرت مجدد "ہمہ اوست" کے مقابلہ میں "ہمہ از اوست" کی ترکیب استعمال کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اشیاء، اللہ سے الگ وجود رکھتی ہیں اور وہ اس کی مخلوق ہیں۔ مگر حضرت اقبال، "ہمہ اوست" یا "ہمہ از اوست" کے مقابلہ میں خدا کو لامتناہی خودی اور انسان کو متناہی خودی، خدا کو قرآن اور انسان کو سیپارہ، خدا کو سمندر اور انسان کو گوہر کی مثال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مادی کائنات ادنیٰ خودیوں کی بستی ہے، ہر شے کی اپنی حیثیت و اساس کے مطابق الگ الگ خودی ہے۔ ان کے نزدیک انسان اور کائنات کی تخلیق سے ایک ہی چیز سے ہوئی ہے اور وہ "امر" ہے۔ ①

خودی اقبال کے پیغمبرانہ کلام و پیام میں خودی کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ نظام کائنات میں انسان کے لیے عبدہٗ کا مقام تکمیل خودی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ شارحین اقبال نے خودی کو خدا کی لامتناہی خودی اور بندے کی شان خودی کے درمیان براہ راست تقرب کا رشتہ پیدا کر دیا ہے اور خودی کو تخلیق کائنات کا منبع قرار دیا ہے۔ جیسے ڈاکٹر ملک حسن اختر نے زیر نظر تحریر میں کہا ہے۔ جسے آپ کے نزدیک امر ہونا چاہیے۔ (کن فیکون) راقم کو خدا تعالیٰ کی ذات کو لامتناہی خودی اور بندے دیگر مخلوقات کی متناہی خودی کی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ تاہم خالق و مخلوق کا تاثر ملتا ہے۔ خودی تسخیرِ کائنات و تقربِ خالق کائنات کے درمیان رابطہ کا ذریعہ لگتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے:

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ

خودی کے لیے امر یا جو لفظ مناسب سمجھیں بدل لیں۔ اپنی مشہور نظم "ساقی نامہ" میں انھوں نے انسان اور کائنات میں موجود اشیاء کی نہایت دلپذیر انداز میں وضاحت کی ہے کہ ہر چیز کی اصل خودی ہے:

---

① مکتوبات امام ربانی۔ دفتر دوم، ترجمہ قاضی عالم الدین، ص ۱۵۔

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید!
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید!
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخیٔ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار ①

حضرت مجدد الف ثانی دنیا کو وہم اور شر کی پیداوار سمجھتے ہیں اور اسے زہر قاتل اور بے کار ساماں کہتے ہیں کہ دنیا بظاہر شیریں اور صورت میں تازہ پرکشش دکھائی دیتی ہے مگر در حقیقت زہر قاتل اور بے کار شے ہے، اس میں گرفتار ہونا مضر اور نقصان دہ ہے۔ دنیا کی نظر میں مقبول شے در حقیقت ذلیل و خوار چیز ہے، اس پر فدا ہونے والا ناسمجھ یا دیوانہ ہے، یہ ملمع کی ہوئی معمولی دھات اور شکر ملے ہوئے زہر کی مانند ہے۔ مگر حضرت اقبال، حضرت مجدد کے خیال سے متفق نہیں، ان کے نزدیک دنیا وہم ہے نہ زہر قاتل اور نہ بے کار ساماں۔ وہ اسے کارآمد چیز سمجھ کر اسے قابو میں لانا چاہتے ہیں اور اس کی تسخیر کا درس دیتے ہیں۔ علامہ اقبال جسم اور دنیا دونوں کو شر نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ بدن، رُوح کا حاصل جمع ہے وہ اسے نظر انداز نہیں کرتے بلکہ بدن کو فتح کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کیا جاسکے۔ ②

حضرت مجدد کے زمانے میں ایک اسلامی حکومت موجود تھی لہٰذا ان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو دین کی طرف راغب کریں اور دنیاوی لذتوں سے دور رکھیں کہ وہ ان میں کھو کر کمزور نہ پڑ جائیں۔ علامہ اقبال کے زمانے میں حکومت مسلمانوں سے چھن چکی تھی۔ لہٰذا وہ بھی مسلمانوں کی بھلائی چاہتے تھے مگر دنیا میں ترقی کے راستے پر انھیں مصروف بھی رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عمل اور حرکت پر بڑا زور دیا ہے تاکہ غیر مسلم غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس طرح کے عمل کی حضرت مجدد الف ثانی کے زمانے میں ضرورت نہ تھی۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب ان کے معتقد مریدوں، امراء اور جرنیلوں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو حضرت مجدد نے انھیں ایسا کرنے سے منع کر کے بادشاہ کی اطاعت اختیار کرنے کا حکم دیا۔

حضرت مجدد اور جہانگیرؒ کے اس واقعے پر ذہن ائمہ کرام امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام حنبل، امام باقر اور امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف جاتا ہے جو دین

---

① کلیاتِ اقبال اردو، ص ۱۹۳۔
② مکتوباتِ امام ربانی، ترجمہ قاضی عالم الدین، ص ۷۵۔

اور معاشرتی مسائل کو سب سے بہتر سمجھنے والے تھے، ان کے وقت خلفاء عباسیہ کی نہایت جابرانہ شخصی حکومت تھی۔ تاہم مذکورہ ائمہ کرام خلفاء وقت کے خلاف شرعاً ناجائز افعال و احکام کے خلاف بلاخوف آواز بلند کرتے اور ان کی ناراضگی پر قید و بند اور جسمانی اذیتیں بھی برداشت کیں مگر ملک کے امن، ترقی اور اجتماعی مفاد کی خاطر اپنے لاکھوں پیروکاروں کو حکومت کے خلاف کبھی فساد، بغاوت یا شورش پر آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح ہمارے دونوں عظیم رہنما علامہ اقبال اور قائداعظم بھی تھے جنھوں نے انتھک کوششوں سے آزاد ملک حاصل کیا۔ قائداعظم نے اپنی طویل جدوجہد کے دوران کانگریس اور انگریز حکمرانوں اور مخالفین کو ہمیشہ مدبرانہ ٹھوس دلائل سے قائل کیا اور احتجاجی، متشدد، جذباتی جلد باز مسلم لیڈروں کی فساد اور بدامنی پیدا کرنے والی سیاست کے برعکس کامیاب رہے۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں:

مصائب میں اگرچہ بڑی ایذا اور تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے لیکن ان میں بڑی کرامت اور بہتری کی امید ہوتی ہے۔ اس جہان کا بہتر سامان حزن و اندوہ ہے اور اس دسترخوان کی خوشگوار نعمت مصائب و آلم ہیں۔ ان شکر پاروں پر داروئے تلخ کا رقیق غلاف چڑھا ہوا ہے۔ (۱)

علامہ اقبال بھی درد و آلم کو پسند کرتے ہیں اور اسے نعمت قرار دیتے ہیں مگر وہ درد و آلم تک فکر، آرزو، جستجو اور جدوجہد کے راستے سے ہوتے ہوئے پہنچتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان مشکلات اور سختی جھیل کر اپنی خودی پہچان سکتا ہے اور تسخیر کائنات کا جو کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہے، اس کی راہ میں عشق کے کئی امتحان اور مقامات آہ و فغاں آتے رہتے ہیں جو اس کے عزمِ تسخیر اور مستحکم کرتے ہیں۔ (۲)

حضرت مجدد چونکہ زندگی میں درد و الم کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، اس لیے وہ عشق کے معاملے میں بھی وصال کی بجائے فراق کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس معاملے میں اقبال بھی ان کے

---

(۱) ایضاً، محمد سعید، ص ۱۸۳۔
(۲) تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ سید نذیر نیازی، ص ۳۰۶۔

ہمنوا ہیں اور زندگی کی تڑپ اور حرکت کو فراق کا ہی مرہون منت سمجھتے ہیں۔ وصال چونکہ حرکت و عمل ختم کر دیتا ہے اور جستجو و تلاش بھی، اس لیے اقبال اس بارے میں فرماتے ہیں:

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب
گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہُو فراق!
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق! ①

"قطرے کی آبرو فراق" حضرت مجدد نے "وصال" کی نسبت "فراق" کو اچھا کہا ہے۔ اقبال کو آپ کا نظریہ فراق پسند تھا۔ اقبال اپنے ایک خط بنام خواجہ حسن نظامی میں لکھتے ہیں کہ: "میرے نزدیک جدائی کی طلب صادق کی تکلیف اور تڑپ عین اسلام ہے اور وصل و ملاپ کی خواہش فریب نظر، رہبانیت اور ایرانی نظریہ تصوف کی طرح ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے مجھے "حسن الوصال" کا خطاب دیا تھا تو میں نے لکھا تھا کہ مجھے "حسن الفراق" کہا جائے، اس وقت میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو حضرت مجدد نے بیان کیا ہے، علامہ اقبال کے دل میں حضرت مجدد کی بڑی قدر و منزلت تھی اور آپ کا نام ہر جگہ ادب و احترام سے لیا ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ② اقبال نے اپنے فکر کی بنیاد حضرت مجدد کے افکار پر رکھی۔ بقول مولانا غلام رسول مہر، اقبال نے حضرت مجدد کے ارشادات و مضمرات کے متعلق سب سے پہلے اندرون اور بیرون ملک اپنے لیکچرز میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اقبال کو جس تصوف سے دلی لگاؤ تھا وہ حضرت مجدد کی فکر کے مطابق ہے اس کی اصل عجمی نہیں حجازی تھی جسے اقبال "اخلاص فی العمل" بھی کہتے ہیں، حضرت مجدد کے ساتھ عقیدت میں وہ فرماتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی ③

---

① کلیات اقبال اردو، ص ۱۱۶۔
② خطوط اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، ص ۳۰۳۔
③ کلیات اقبال اردو، ص

حضرت اقبال اور حضرت مجدد الف ثانی میں ایک مشترک بات یہ بھی ہے کہ دونوں کے والد گرامی وجودی مسلک پر تھے۔ حضرت مجدد نے فلسفۂ وحدت الوجود کی اوّل اوّل موافقت کے بعد مخالفت کی جو دراصل اس کے ضرر رساں اثر کی وجہ سے تھی جو امتِ مسلمہ کو بے عملی کی طرف مائل کر رہی تھی۔ اقبال اور شیخ مجدد دونوں کو ابن عربی کے بلند علمی مقام سے بخوبی آگاہی تھی اور ان کی نیک نیتی کی بھی۔ اس لیے انھوں نے "وحدت الوجود" اور "وحدت الشہود" میں اشتراک کے پہلو تلاش کر لیے اور دونوں کو درست سمجھنے لگے۔ اگرچہ علامہ اقبال نے وجودی فلسفہ کے منفی اور انفعالی اثرات کو ملت کے لیے ہمیشہ مضر سمجھا جو کہ وجودی صوفیاء کی سہل پسندی، جذب و مستی اور تصوف کی غلط تاویلات سے رائج ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق اگر ابن عربی کو "سرّ الوصال" اور حضرت مجدد الف ثانی کو "سرّ الفراق" کہا جائے تو ان کے "فلسفۂ وحدت الوجود" اور "وحدت الشہود" کا امتیاز نمایاں ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال اور حضرت مجدد دونوں طبقۂ علماء کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور بعض صوفیاء چونکہ شریعت کو اہمیت نہیں دیتے اور شرعی احکام کی پابندی نہیں کرتے اس لیے ان کے نزدیک ان کی پیروی جائز نہیں۔ ان پر اس وقت سُکر کی حالت طاری ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد طریقت کو شریعت کا خادم کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص... جب تک یہ تینوں جزو نہ پائے جائیں، شریعت مکمل و مصدقہ نہیں ہوتی۔ جب شریعت کی صحیح تعمیل ہو گئی تو حق سبحانہ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے جو تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں سے اعلیٰ اور فائق ہے۔ ایسا کوئی مقصود و مطلوب نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان کو اس کی طلب اور محتاجی ہو۔ طریقت اور حقیقت جن کی بناء پر صوفیاء کرام ممتاز ہیں، دونوں شریعت کی خادم ہیں۔ ①

علامہ اقبال نے ابن عربی کے حوالے سے ختمِ نبوت کے بارے میں غلط فہمی دور کر کے ایک بہت بڑی دینی خدمت سرانجام دی ہے جس کا سرسری ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

قادیانیوں نے ابن عربی کے نظریات کی غلط تاویل کر کے مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت

---

① مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، ترجمہ قاضی عالم الدین، ص ۲۲۱۔

کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا تو علامہ اقبال نے ابن عربی کے نظریات کی وضاحت کر کے انھیں اسلام کے مطابق ثابت کیا اور قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔

ابن عربی کا نظریہ تھا کہ ایک مسلمان ولی کا اپنے روحانی ارتقاء کے دوران شعور نبوت تک پہنچنا ممکن ہے۔ علامہ اقبال نے کہا یہ نقطۂ نظر درست بھی ہو تو اسے ذاتی تجربہ کہا جا سکتا ہے جس کی کوئی اجتماعی حیثیت نہیں، نہ ہی کوئی اپنے تجربہ کی بنا پر دعویٰ نبوت کر کے کوئی تنظیم یا امت بنا سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو اپنی باطل نبوت کے انکار پر اسلام کا منکر ٹھہرا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کو اس بات کا قطعی یقین تھا کہ ابن عربی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح اٹل ایمان ہے۔ اگر انھیں کشف کے ذریعے نظر آ جاتا کہ ہندوستان میں ان کی تحریر کی آڑ لے کر نبوت کا رد کیا جائے گا تو وہ یقیناً مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارانِ اسلام کے بارے میں متنبہ کر دیتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ابن عربی، حضرت مجدد اور علامہ اقبال تینوں شریعت کی پابندی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ تینوں کے مقاصد گو یکساں ہیں مگر طریق کار کے سلسلہ میں کہیں کہیں ان کا راستہ دوسرے سے مختلف ہو گیا۔

[25] M. Israr Ahmad, *Khutabat-e-Khilafat*, p 73.108.
[26] Tahir-ul- Qadri, *Islamc in Various Perspective* Idare- Min haj ul Quran, p 35-40.
[27] Ghulam Ahmad Parveez, *Quranic Faiseaky*, vol-1. p 471-76.
[28] *Kulliat-e-Iqbal* Urd p 424.
[29] Ibid., p 320.
[30] Ibid., p 4.8.
[31] Ibid., p 259
[32] Ibid., p 326
[33] *Iqbal, Reconst - ction of Religious Thoug ts in Islam*, p 148.
[34] *Kulliat-i-Iqbal Urdu*, p 308.
[35] Ibid., p 362.
[36] *Reconsturction of Religious Thoughts in Islam*, p 121.
[37] Ibid., p 127.
[38] *Kulliat-e-Iqbal Urdu* p 264.
[39] Ibid , p 263.
[40] *Reconsturctio of Re gi us Thoughts in Is am* p 178.
[41] *Kulliat-e Iqba Urdu*, p 402.
[42] Ibid., p 415
[43] *Reconsturction of Rel gious Thoughts in Islam*, p 139.
[44] *Kulliat-e-Iqbal*, p 261.
[45] Ibid., p 332.
[46] Ibid., p 274.
[47] Khalid-bin- S eed, *The Political System in Pakistna*, Oxford University Press Karachi, p 33.
[48] Syed Riaz Ahmad, *Maulana Mududi and Islamic State*, People Publishing House LHR, p 48.
[49] Govt. of Paki tan, *The Constituent Assembly of Pakistan Debates*, vol. v no 2., Govt. Press Karachi. p 13-14.
[50] M ulana Taqi U mani, *Nafaz-e-Shariat aur uskey Masail*, Maktaba Dar-ul-Uloom, Karachi , 32-33.
[51] *Kulliat-e-Iqbal*, p 261.
[52] Ibid., p 332.

Notes and References

[1] Dr. Muhammad Hamidullah, *Khutabat-e-Bahawlpur*, 1-40.
Quran is a primary source of Islamic legislation which is eternal and its injunctions are valid for all the times.

[2] Ibid., Sunnah, 41-82 It is second source which refers to model behaviour of the H. Prophet, it is an ideal for Muslims to follow.

[3] Ijma. Dr. Ahmad Hassan *The Doctine of Ijma in Islam and modern Trends*, Islamic Studies Islamab d and Arguments for an Authorety, Oslamic studies Islamabad. P 39 52.

[4] Qyias Dr M. Hamidulla *Khutabt-e-Bahwalpur*, p. 83-150, Maulana Shibli Nomani, *Seerat un Naman* p 185.

[5] Preference of Qyias over unauthentic Hadit, *Seerat un Naman*, P. 233

[6] Istehsan. Dr M Hamid ullah. *Khutbat- e- Bahawlapur*, p. 128.

[7] Dr. Ahmad Hassan, *The Early Development of Islamic Jurisprudance* text and narrateors of Hadith of Muad-bin-Iqbal Jabal, p 218-219.

[8] Ijtehad, M Hamidulla, *Khutabat-e Bahawalpur*, p 337-38. A. Rehim, *Principles of Muhammaden Juritpsudance*, Ali Pakistan legel Decions, p 158-68.

[9] Taqlid, Maulana Ashraf Ali Thanvi, *Taqlid ul- Ijtehad*, Idare-e-Islamiat Lahore, p 3-106 M. Qari Muhammad Tayyab, *Ijtehad aur Taqlid*, Idare-Islamiat, Lahore, 5-126.

[10] *Kulliat-e-Iqbal* Udu, p. 107.

[11] Dr. Fazal ur Reham, *Islam*, University of Chicago, p 193-211.

[12] Kulliat-e-Iqbal Urdu, p 318.

[13] *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, S. Nazir Niazi, p. 272.

[14] *Kulliat-e-Iqbal Urdu*, p 264.

[15] Ibid., p 180.

[16] Ibid., p 341

[17] Ibid., p 657.

[18] *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Institute of Islamic Center, p. 145.

[19] Marcia K. Herman, *The Conclusive Arguments from God*, حجۃ البالغہ Leiden-Nethes Laud (Shah wali Ullah). P 357-58.

[20] Muhammad Khalid Masud, *Iqbal's Reconstruction of Ijthead*, Islamic Research Institute, Islamabad, p 69

[21] Muhammad Sarwar مولانا عبید اللہ سندھی کی حیات، سیاسی افکار و تعلیمات، سندھی اکیڈمی لاہور، p. 72-74.

[22] *Hayat-e-Javed*, Ishrat Publications Lahore, p 494-717.

[23] Aziz Ahmad, *Islmaic Modernism in India and Pakistan 1857 to 1964*, p. 208.

[24] *Tarjmanul- Quran*, Nov.-Dec., 1938, p 6-15, *Process of Islamic Revolution*, Islamic Publication, p 239-41.

that. God Almighty is the only Sovereign.

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری[51]

So it may be concluded that there is no contradiction between Shariah and reason. Both are inter dependant and interrelated to accomplish the targets before the Govt. Resultantly objectives Resolution established a foremost model for modern collective Ijtihad in order to incorporate Islamic essence into the country in the future political frame Work.

It may also be mentioned in the last that this achievement paved the way of approval of present constitution of Pakistan with strenuous and sagacious efforts of Prime Minister Zulfiqar Ali Bhutto with consensus of all political parties and Ulema of various schools of thought.

However, it is unfortunate that unwarranted corrupt and influential politicians and fortune hunters have made Pakistan a happy hunting ground for amassing illegal wealth misusing their position and power and because of their lust and avarice the elected governments often fail due to lack of loyalty to country and dedication to their duty creating chaos and anarchy which provided in roads to military take over three times since creation of Pakistan. So there is a great need that, law and religion should groom the citizens in general and politicians in particular to stand committed to follow the path of high morality in their private, public and political lives without which the unstable, governments will turn the situation into mockery of constitution and endanger the existence of country. In this regard Iqbal has given final verdict,

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[52]

freedom of thought and expression and equality before law which presently was possible only through Ijma and Ijtihad together.

Both the Schools held their ground strictly without likelihood of mutual compromise. However Prime Minister Liaqat Ali Khan succeeded in having the Objectives Resolution passed by the Constituent Assembly on which fortunately both sides felt satisfied. The gist of important clauses is stated here which made it possible to satisfy both camps.

" In the name of Allah the most Beneficent and the most Merciful"

Whereas Sovereignty over Universe belongs to Almighty Allah alone and the Authority which He delegated to the State of Pakistan through its 'people for being exercised within limits prescribed by Him is sacred trust, the State shall: exercise its powers and authority through the chosen representatives of people

Wherein the principles of democracy freedom, equality tolerance and social justice as enunciated by Islam shall fully observe and shall guarantee all fundamental rights.[49]

Thus the objectives Resolution was the first collective Ijtjhad not created by the ulema as a mujtahid but by modern theologian and elected representatives. The constituent assembly of PakiStan was the first political institution to get the powers of MUJTAHID-E-MUTLIQ in the history of Fiqh and it will interpret Shariah and prepare law in future also. So the issues or bills are debated in the parliament and outside as well by citizens, ulema, elites and the press to share participation.

This revolutionary change has proved that Islam is not a static religion and is capable to adjust, adopt, modify interpret its social and practical laws. It has also demonstrated that doors of Ijtihad were not closed at any time. Islam does not believe in stale political system and may adopt any system desired by elected people who are trusted to rule independently and justly.[50]

Pakistan is the 1st state in modems times to confirm

of history ultimately giving rise to the movem nt of demand for Pakistan in India on the basis of two nations theory achieving the goal in 1947 and then passing of Objectives Resolution in 1949 to form basis for the legal reforms according to tenets of Islam in the form of Pakistan constitution.

The Muslims established that in India there were two nations and the Muslims were separate from Hindus on the basis of different religion, civilization, history customs and culture. The goal of independent country was achieved but there was wide difference among orthodox school and modernists in enactment of law in the newly born country. The traditionalist comprising of Deo band, Brelwi, Jammiat ul Ulma, Ahrars and Khaksars wanted enforcement of Shariat in the old and original form acording to Quran and Sunnah. The Muslim League belonging to modernist group and successful in getting independence from the rulers wanted that country should be governed in accordance with fundamental principles of Islam employing spirit of ijtihad in legal enactment as the modern conditions required as Iqbal and Quaid-e-Azam wanted as the founder of Pakistan.[47]

Quaid-e-Azam wanted that the religion should be regarded a personal matter of each individual and the constitution should ensure each citizen whether Muslim, Parsi, Hindu and Christen equality in eye of law on the secular basis. This was not acceptable to the traditionalists who demanded implementation of Shari-ah apparently in Taliban style. However, since Quran did not constitute detailed legal code for the unperceived future needs the legislature could frame certain laws within frame work of Quranic principles to meet the needs, of modern society as there is constant change in life, leading to unknown destinations.[48]

There was sharp difference between orthodox and modernists on the definition of Islamic State. According to modernists it is not theologian, western brand, despotic or socialist one. Islam has not specifically marked any one to be framed strictly but has given importance to human dignity -

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر وسلطان سے بیزار ہے[42]

The Ijmah in the form of assemblies is a modern development that expresses the collective will of whole community. In the changed circumstances the elected representatives, theologians, scientists, industrialists, trade experts, educationists all can coordinate to formulate necessary regulations after detailed discussions, experiments seminars and debates which will remove stagnation and open way towards progress and prosperity. In framing the new laws the Islamic ethical teachings should be kept in view. Western democracy according to Iqbal failed due to lack of universally applicable moral values known as liberty, equality, fraternity and tolerance as stated by him:[43]

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری[44]

نظامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی[45]

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے[45]

In view of the above Iqbal's message to reconstruct the role of Ijtehad in cooperation with Ijma in the modern conditions must be given full and practical consideration keeping alive the spirtt of Islam.

Coming to the last part we can see the impact. of Muslim theologian, scholars and reformers efforts in different periods

According to Iqbal we are passing through a period similar to tht of Protestant revolution.

We should learn how the change took place for emancipation of common man from the yoke of priesthood. But that renaissance turned into a political movement replacing the religious strangle hold with national rivalries and capitalistic suppression as evidently said:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات[39]

We on the contrary should always keep in view the spirit of Islamic unity, brother hood and liberalism.

According to Iqbal Ijma is most important legal notion in Islam. It is not only a source of fiqh but an institution through which consensus of entire Muslim community could be achieved. Due to despotic regimes the Ijma became dormant under one man rule and Ijtehad became an individualistic approach rather than collective effort. Now in democratic form of Government the transfer of power of Ijtehad from individuals to legislative assemblies has made it possible to continue the sources of law of Ijma and Ijtahad within the working of assemblies which represent the whole nation. The desired revolutionary change can be understood as expressed below:[40]

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو[41]

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نظر نہیں سوئے کوفہ و بغداد[35]

In fact his poetry and prose after return from Europe is mostly focused on the importance of Ijtehad.

Iqbal praises IBN-e-Tamiya, the great Muslim scholar and Mujtahid for his efforts for freedom of Ijtehad. He also praised Turks when they abolished Khilafat to replace the individual institution by collective representation of people. This step according to him is Ijtehad. In his views renaissance in Islam through Ijtehad was very necessary so that under liberal and enlightened environments the Muslims in subcontinent concentrate on becoming a strong modern individual nation and then gradually proceed furthers to develop fraternal relations in Muslim states and ultimately bring global unity of mankind.[36]

As there was no written law in Islam before Abbasi Khilafat therefore, with the grown civilization the early schools of Islamic law became inadequate and the advancement, adjustment, reinterpretation and reconstruction of Islamic law became imperative and that is what Ijtehad enunciates. He regrets that during past several centuries religious thoughts in Islam remained practically. stationery and dormant.. The only course left for us is to approach modern knowledge with keen, continuous but independent attitude in the light of fresh discoveries in science and art even though we may have to differ from those who have gone before us. Unless we demolish the dilapidated obsolete structure of the past traditions we cannot have a bright and a secure future as expressed in the words of Maulana Roomi.[37]

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند[38]

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات[30]

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی[31]

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں[32]

Iqbal exercised tremendous impact on theological, political and social institutions to open doors of independent reasoning and set-forth new principles of legal advancement to solve the problems faced by the Muslims and emphasized that due need of fresh interpretation in term of Islamic Jurisprudence for application to daily vital issues was extremely essential. The beaten track i.e, TAQLID in his views was suicidal for the Muslims as remonstrated by him.[33]

تعمیر نو سے ڈرنا طرز کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

Emphasizing upon the need of Ijtehad he concluded that Islam discards stagnation and obsolete conceptions He persuades to gain fresh grounds and creation of new practical ideas in this evolutionary and expanding world.

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز[34]

'against Ijtehad. In conclusion it can be drawn out that Islamic countries need an effective institution to make Ijtehad cooperative and collective to transform the countries into civilized and democratic society in order to solve their religious, political, social, economical problems.

The third part of essay goes totally in describing contribution of Allama Iqbal towards reconstruction of Islamic thoughts under the conception of Ijtehad. According to Iqbal Islam is a positive science. It invites study of nature which is dynamic and always in motion and evolutionary process. The very purpose of man's entrance on the earth is to study and explore the nature and conquer the innumerable and vast treasures scattered allover the universe. Let us look at the scene when the earth welcomes Adam when he steps first time on it as described in Iqbal's poem:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ[28]

Deen-e-Islam which is a complete code of conduct as ordained by Allah:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

can never therefore, be static but is flexible, advancing and expanding capable of making adjustment all the times according to new situation as Iqbal says:-

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون[29]

reforms in polygamy, banking, conception of Riba, education trade, commerce etc.[22]

On the other side we observe that the role of orthodox theologians like Deoband and Brelavi schools and of Jamiat ul Ulna. Hind was static and against Pakistan Movement. However, Maulana Shabbir Ahmad Usmani a member of Jamiat was a liberal theologian who formed separate party and played positive role in achievement of Pakistan.[23]

Maulana A.A. Maududi was a. neo-traditionalist, interpreter of modern Islam. He wrote extensively on wide range of topics of religious, political, social, cultural, trade, commence, woman's position, Zakat, War, Jazia etc. Rather he gave a complete system of Government in the light of Quran and Sunnah giving supreme power to Amir of his Jamat as a Naib of Allah the absolute sovereign Maulana Modudi is a midway supporter of Ijtehad.[24]

Dr. Israr Ahmad an other modern thinker who holds modern education and knowledge necessary to achieve targets. He favours Ijtehad so that we may march along with the time. He is great admirer of Allama Iqbal's thoughts.[25]

Prof. Tahir ul Qadri is an other theologian who favours Ijtehad considering necessity of taking in to account the contemporary contingencies and current realities.[26]

Apart from above Ghulam Ahmad Parvez is considered ultra modernist and has formed a. new Fiqh from Quran. He tried to revolutionize every thing like Sir Syed Ahmad and also impressed the philosophy of Iqbal. He had two objects i.e., to interpret independently without jurists limitations the message of Quran and (2) to present Islam rationally in response to modern spirit and circumstances. According to his system of government the State should keep all resources and means of production and surplus wealth under its control and by equitable distribution close the gap between rich and poor. He is quite liberal in equal rights of man and woman and is against obligatory "Pardah and. Polygamy"[27].

From the foregoing we can understand to what extent the above named theologians and scholars are in favour of or

Sunnah with due solemnity, and piety.

The Modernists balamed inactivity and lack of updating education and knowledge according to new age. In consequence under this gloomy and dismal conditions several reform movements sprang up among the Muslims in 18th Century onward.

First was Wahab-Ud-Din movement started by Abdul Wahab in Arabia preaching return to orthodox Islam rejecting mystical and soofi pattern of religion favouring aloofness from world which had made Muslims inactive devoid of true spirit of religion detrimental to progress[18]

In India Shah Wali Ullah led other movement. He desired a new system in Islamic Law and presented his philosophy in his famous book Hujat-Ul-Baligha. He was stanch supporter of Khilafat. Shah Abdul Aziz, Shah Ismail; Syed Ahmad Brelwi were his prominent and ardent successors.[19]

The 3rd movement was of Pan Islamic led by S. Jamal-ud-Din Afghni, who wanted the freedom of entire Muslim world political and religious and advocated unity among them Iqbal held him in great esteem for his revolutionary thinking and efforts. His disciple Muhammad Abduh of Egypt and Sir Syed Ahmd in India took up the task to prove that Islam was not against reason and science. They wanted to solve the problems with modern methods without violating eternal principles of Islam.[20]

Then Abaid ullah Sindhi advocated both modern Muslim thought and Soofism. He was more in favour of Ijma than Qiyas. He liked that Fiqah and reason should both go together. He was in favour of material revolution with the help of scientific and modern knowledge to make Muslim powerful and prosperous.[21]

Sir Syed Ahmad was founder of Ali Garh Movement. He was a crusader against Taqlid and staunch believer in Ijtehad. He is considered as father of Indo-Pak modernists and greatly influenced Pakistan Movement. He was champion of reason against blind tradition. He gave new direction to Muslim in nationality, culture, politics and religion. He introduced

ground, the undignified and disgraceful plight of economic, political and cultural subjugation of Western countries may continue incessantly. Iqbal laments the past glory of the Muslims saying:

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے [16]

However, in order to close the gap between the West. &, Muslim world the doctrine of Ijtehad should be employed as an instrument of rationality in Sharih Fiqh and Hadith. and other, modern and scientific subjects to cope with challenges of modernization. In order to gain ground it is extremely essential to make progress in religious research alongwitll the fields of science, technology, industry, commerce and latest arts like electronic media, information technology and communication. The situation demands that the instrument.of ljtehad be given due importance and free hand to every individual. to exercise his impact collectively in assemblies for mutual discussion criticism adopting necessary steps according to the present age in free and liberal atmosphere and put forth its decisions in practice for betterment of all people in the frame work of Ijtahad provided by Imam Abu Hanifa, In this way the efforts of every individual canbecome fruitful for the Ummah. as Iqbal says:-

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ [17]

Now 1 come to the 2nd part of article. Because of centuries long slumber of backwardness, the people started thinking that there was something wrong with the Muslim nation or the religion. The orthodox held the Muslims responsible for not following the precepts of Quran and -

despotic rule saying:[11]

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز[12]

The religious traditionalist like Imam. Malik, Imam Shah and such others also set strict barriers on Ijtehad. The fall of Baghdad and Ghamata brought destruction of gigantic libraries containing vast precious knowledge of all sort of prevailing subjects and deprived the Muslim world of their invaluable legacy. On the other hand the European seized this opportunity of liberal approach for acquirement of knowledge and their thinkers like Luther, Voltair, Rousseau etc spread a wave of awareness bringing renaissance in place of deep dhrkness of ignorance and backwardness. Iqbal has pointed out this tragedy in the words:[13]

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز[14]

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ[15]

Thus the doors of Ijtehad and advancement in knowledge and science were closed for several centuries till the new revolutionary thinkers in 18th century onward like Muhammad Abdul Wahab in Arabia. Shah Wali Ullah, Sir Syed Ahmad came to amend the dismal situation and revive spirit of Ijtehad in resolving the conflict between reason and theology to bring the Muslims realize their negative and passive attitude. Alas much precious time has been lost and the ummah has fallen centuries back and unless some dynamic group of leaders inspire them to cover up the los.

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے[10]

Since the modern time is faced with enormous and complicated political social, economical and religious problems which can not be surmounted with the help of text of Quran and Sunnah so- it is imperative on the Islamic jurists to apply their minds to elaborate upon the vast and hidden knowledge of Quranic verses to meet the new situations.

This has led to emergence of three groups of religious schools. 1. Traditionalists i.e., the followers of Taqlid like Deoband School, Brelwi School (2) Neo-traditionalists such as Abul-Ala-Modudi, Dr. Israr Ahmad, Dr. Tahir Ul Qadri and (3)The Modernnists, that of Sir Syed Ahmad. Allama Iqbal, Dr. Fazal.ur Rehm an and Chulam Ahmad Pervaiz etc Considering the condition of prevailing situation it can easily be understood which group infact can encounter the problems to meet the challenges of time. The situation demands serious reconsideration of Islamic Legal System to reconstruct the orthodox rules for adjustment to meet new constitutional and legal needs.

It is great misfortune of the Muslims Ummah that vested interests in politics and theology gave a great set back to the advancement of free thinking, learning and expression of opinion to perpetuate their hold on power and position in their respective areas. The class of thinkers and researchers like Motazila who propogated reason, argument- and deductive method, to arrive at the truth were labeled as misled and "Bidati" and suffered oppression and restrictions. The Abbasi despotic rulers imposed ban on the right of free thinking, research and expression to save their despotic rule which resulted in stagnation in the flow of learning and thus the Muslims fell behind in advancement, Iqbal has criticized

to apply his mind i.e., Qyias for deciding the issues in absence of solution from first three sources is a glorious example of Islamic liberalism to prove it as a dynamic and progressive religion allowing adjustment in legal issues to the coming generations.

WHAT IJTEHAD MEANS

Literally it means employing utmost care, effort and hardship in Shariah by the jurist for deducting new ruling to meet a challenge or situation without violating spirit of Quran and Sunnah. This act of deduction, analyzing and formulating rules from the text of Quran and Sunnah to adjust the new situation is known as Ijtehad. The most common meaning attributed to term Ijtehad are independent reasoning or Ra'y. According to Imam Ghazali, Ijtehad or Ra'y should be exercised only when there remains no possibility of finding a solution from first three sources of law i.e. Quran, Sunnah and Ijmah. However, Qyias has established itself the 4th source of Islamic Law and as long as the humanity keeps inhibiting on this earth, the reliance on Ijtehad can not be forsaken.[8]

Now as the mankind in the 21st Century has entered an age of computer science, internet, space exploration and innumerable sophisticated devices, the multifarious problems and issues un anticipated fourteen hundred years ago can not be solved without independent reasoning captioned as Ijtehad.

On the opposite side the classical theologians believe in TAQLID or blind following without any effort to verify the veracity or truth of the matter and consider it a virtue and piety to bind themselves with the Shariah as in their opinion it is ordained by Quran and Sunnah. Thus they have closed upon them selves the doors of advancement and progress lagging behind the open minded nations. IQBAL has criticized this passive attitude saying:[9]

1. Hanfi School after the name of Imam Abu Hnaifa.
2. Maliki School attributed to Imam Malik
3. Shafee School after the name of Imam Shafi
4. Hembli School attributed to Imam Ahmad Bin Humbel.

Since the subject under discussion pertains to Ijtehad therefore to be precise it may be stated that Ijtehad ammanates as an advance from of Qyias, the method of reasoning practiced by Imam Abu Hanifa, who was the first and greatest advocate of validity of free and independent reasoning i.e, Qyias. His method of arguments is know as Istehsan i.e., to establish legal rules that meet, the requirements of equity and justice in daily life. He always kept in view common sense and reason in the perspective of Quran and Hadith injunctions and thus his Fiqh is more sensible, judicious moderate and easy to follow than other schools of Law. Although Imam Malik is bitter opponent of Qyias is comparison to Ijma but still the followers of Abu Hanifa are in majority among the Muslims in the world.[6]

The importance of Qyias is widely acknowledged as it is the basis of foundation on which the structure of Ijtehad stands gloriously in modern Assemblies.

No written jurisprudence existed during time of the Holy Prophet. The questions asked by his Sehaba were answered by the H. Prophet and his conduct was absolute authority for the Muslims but no boundary walls were erected to decide issues of different nature and those which did not occur yet which were left to be decided by independent reasoning according to specific situation and circumstances. Had the Prophet laid down rigid rules for solving such issue, it would have deprived coming generations of using reason and framing laws according to the needs of time. In support several actions of Hazrat Umar deciding matters according to his judicious reasoning without consulting the Holy Prophet can be cited which were confiremed later as correct by the Holy Prophet or Vahi. The Hadith of Sehabi Muad Bin Jabal

IJTEHAD WITH REFERENCE TO IQBAL AND PAKISTAN

The article captioned above is divided in four part. In the first part, the origin of Ijtehad is traced out in the historical perspective which is about the early years of Khilafat-e-Abbasia in the period of Imam Abu Hanifa.

Before that time there were four sources of Islamic Law acknowledged commonly which are (1) Quran[1] (2) Sunnah[2] (3) Ijma and (4) Qyias. The authority of first two is absolute and the jurists obtained guidance from these in settling legal issues and their authority was a part of faith.

The third source i.e., Ijma was defined as unanimous agreement of jurists of community on a certain issue on the basic of Qyias which by the passage of time has assumed form of modern assemblies or the house of parliament to decide issues by majority's consent after through discussion and debate by the members of pro and opposite sides. Imam Malik was stanch exponent of Ijma.[3]

The fourth source is called Qyias meaning a systematic and very careful method of reasoning keeping in view all the QUranic verses although not applicable directly but having relevance to help the jurist, arriave at an equitable decision in solving specific issues.[4] Iman Abu Hanifa relied mostly on Qyias by his impeccable power of reasoning so much so that in particular issues he preferred Qyias over Hadith as in his views the veracity and correctness of Hadith could be doubtful and if the source is not reliable in that case he avoided to rely on Hadith for fear of committing the sin of disrespect to the Holy Prophet.[5]

There are four schools of Islamic Law generally acceptable which were formed in the 2nd century of Islamic calendar and these are:

مرزا محمد اسلم



گولڈ میڈلسٹ تحریکِ پاکستان
جائے پیدائش: شہرِ اقبال سیالکوٹ
تعلیم: ایم۔اے اکنامکس

درس گاہیں: مرے کالج سیالکوٹ، اسلامیہ کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی، رزم گاہِ حیات
ذریعہ معاش: ایک مقتدر صنعتی ادارے میں کمپنی سیکرٹری شپ تا ریٹائرمنٹ

اقبال نے مولانا روم کو اپنا روحانی مرشد قرار دیا ہے۔ جس طرح انھوں نے تاتاریوں کے ہاتھوں عالمِ اسلام کی تباہی کے بعد شکست خوردہ مسلمان قوم کی پستی، رسوائی کی مایوس کن حالت کو اپنے مثبت فکر اور کلام سے حوصلہ مندی اور عملی زندگی کی طرف مائل کر کے دینِ اسلام کی سچائی کو ثابت کیا اور تاتاری بھی اسلام کی حقانیت قبول کر کے دینِ اسلام کے محافظ بن گئے۔ اسی طرح اقبال نے موجودہ دور کے مسائل کا حل مولانا روم کے فکر و تشریحِ قرآن کی روشنی میں پیش کیا تاکہ مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ علامہ اقبال کا ارشاد ہے:

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

اس کتاب کے مضامین تاریخِ اسلام کے وسعتِ تناظر میں علامہ اقبال کی نابغۂ عصر، دیدہ ور اور دانائے راز شخصیت کے فکر و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمان پھر اسی دورِ عظمت و جہانگیری کی طرف لوٹ سکیں۔ جس کے لیے علامہ اقبال کا مختصر پیغام یہ ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اسی ضمن میں مصنف نے علامہ اور مسلم مشاہیرِ عالم کی رہنمائی میں دین سے مخلصانہ وابستگی کے ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت مسلم قوم کے مسائل کے حل کے لیے جذبۂ فکر و عمل کو ابھارا ہے۔

اُمید ہے قارئین کرام ایک روشن مستقبل کی نوید دینے والی اس ادبی کاوش کو شرفِ قبولیت عطا کریں گے۔

مکتبۂ جمال
تیسری منزل حسن مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
Cell: 0300-8834610 Ph: 042-37232731
mjamal09@gmail.com - maktabajamal@yahoo.co.uk